راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 22واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

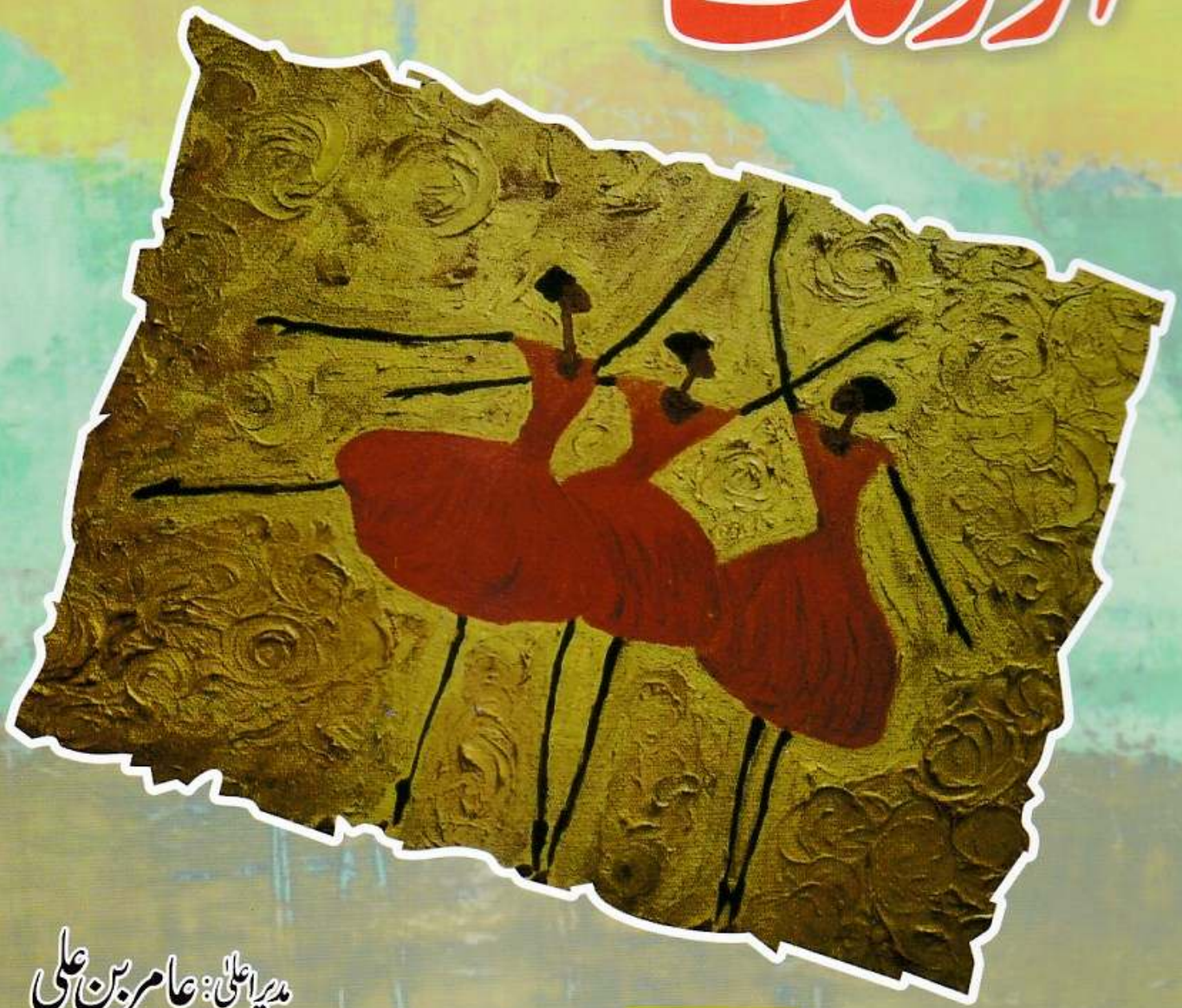

مدیرِ اعلیٰ: عامر بن علی

مدیر: حسن عباسی

مارچ
2021

شاعری اور نثر دونوں میں میرا دل دھڑکتا ہے

نامور شاعر، ادیب، کالم نگار، اور ماہرِ تعلیم

ناصر بشیر

سے مدیرِ اعلیٰ ارژنگ، معروف شاعر،
کالم نگار اور سفر نامہ نگار **عامر بن علی** کا مکالمہ

ادب کے مستقبل سے مطمئن نہیں۔ ابن انشاء اور عطاء الحق قاسمی پسندیدہ کالم نگار ہیں

زندگی کا مشاہدہ شاعروں، ادیبوں کو لکھنے کی تحریک دیتا ہے

س: ناصر بھائی! سب سے پہلے اپنے سوانحی و ادبی پس منظر کے بارے میں آگاہی دیجیے۔

ج: میں ۶ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو (آج سے باون سال پہلے) ملتان میں اپنے ننھیال میں پیدا ہوا۔ میرا ددھیالی شہر لائل پور تھا جو اب فیصل آباد کہلاتا ہے۔ والد گرامی بشیر احمد راٹھور لکھنے پڑھنے والے آدمی ہیں۔ انھوں نے کتابیں جمع کرنے کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ میری والدہ مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ اگر تمھارے ابو ہر روز دو تین کتابیں لانے کے بجائے ہر روز ایک اینٹ خریدتے تو آج ہمارا بھی ایک ذاتی مکان ہوتا۔ آپ سن کر حیران ہوں گے ہمارا پورا خاندان آج بھی کرائے کے مکان میں مقیم ہے۔ والد صاحب بھی کرائے کے مکان میں رہتے ہیں اور میں بھی۔ اس کے باوجود اپنے وطن سے ہماری محبت ہر روز دو چند ہو جاتی ہے۔ میری پہچان پاکستان سے ہے اور الحمدللہ میرے پاکستانی کی شعری و ادبی شناخت میں ہوں۔ مجھے دنیا بھر میں ایک پاکستانی شاعر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ محترم مجیب الرحمٰن شامی تو مجھے ''شاعرِ پاکستان'' کا خطاب دے چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری غزل آج کے پاکستان کی تخلیقی گواہی ہے۔ میں خود کو مولانا الطاف حسین حالی، اکبر الٰہ آبادی، اقبال، ظفر علی خاں، فیض احمد فیض، احمد فراز اور حبیب جالب کا مقلد سمجھتا ہوں۔ مقلدی شاعری کو تخلیق کا مرتبہ دینا کوئی ان شاعروں سے سیکھے۔ کم از کم میں نے تو سیکھ لیا ہے۔

بچپن کتابوں میں گزرا۔ اس لیے صحافت اور شعر و ادب ہی کی طرف آنا تھا۔ ملتان میں زمانہ طالب علمی ہی میں روزنامہ ''امروز'' اور روزنامہ ''نوائے وقت'' میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 22 واں سال

Monthly Arxang Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ ارژنگ لاہور

جلد نمبر 22 مارچ 2021 شمارہ نمبر 3

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیران ◉ حسن عباسی ◉ لبنیٰ صفدر

{ مجلس ادارت }

جعفر حسن مبارک ◉ ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم

{ مجلس مشاورت }

◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد نذیر ساحل (سپین)

کمپوزنگ ● زرناب کمپوزنگ : 0321-4730769 زوگرافز ● نعمان حسن :0333-4918383

سرورق: ڈاکٹر فوزیہ فاروق آرٹ اینڈ گرافکس ● محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 تازہ کاروی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ ایزی پیسہ، موبی کیش، یو پیسہ یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ پہلی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد و نعت ' 2

مضامین:

- غلام محمد قاصر کی تقدیسی شاعری / سید صبیح رحمانی ' 4
- ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' / جمیل یوسف ' 6
- عبدالعزیز: شہرت سے بے نیاز عبقری / مختار عزمی ' 10
- ڈاکٹر عاصم ثقلین کا بھارتی اُردو فلمی شاعری پر مقالہ/ نذیر خالد' 15
- مظہر بخاری - شمع محفل تھا وہ شخص / عامر بن علی ' 18
- جدید غزل کا موضوعاتی مطالعہ /لبنیٰ صفدر '19
- آبروئے ادب - اقبال راہی /سید علی حسین عابدی '23
- ایک کثیر الجہات ادبی شخصیت / قاسم خیال '25
- بے وفا کون / امین کنجاہی ' 26
- سفید پرندہ / ڈاکٹر انجم طاہرہ ' 27
- حال کا سلطان / حرا بتول '29
- خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے (طنز و مزاح)/نور کمال شاہ '30

شاعری: 32 تا 35

افسانے

- نوچندی جمعرات / شائستہ مفتی ' 36
- چوبارے کی محبت / نوین روما ' 39
- حافظ زینب خالد / دو کاندار اور طوطا ' 42

شعری گوشے:

- فرحانہ امبر، شازیہ رباب، قندیل بدر، 44 تا 46
- بقیہ انٹرویو: ناصر بشیر ' 47

ادبی خبریں ' 51

- بقیہ انٹرویو: شہزاد نیر' 52

ادبی خبریں ' 55

نامہ ہائے احباب ' 56

+++++

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku. Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد

اس کی عظمت کے اعتراف میں ہوں
گھر میں بھی حالتِ طواف میں ہوں
جانیے مت اسے قرنطینہ
گھر کے اندر میں اعتکاف میں ہوں
منکشف ہو رہا ہے کیا کیا کچھ
ان دنوں اپنے انکشاف میں ہوں
کوئی باہر سے اب صدائیں نہ دے
قریۂ عین شین قاف میں ہوں
تہہِ میزاب تھا نسیمِ سحر
باوضو ہو کے اب مطاف میں ہوں

نسیمِ سحر/راول پنڈی

مغفرت کی سبیل کرتے ہیں
حمدِ ربِ جلیل کرتے ہیں
گڑگڑاتے ہیں آخرِ شب میں
اور سجدے طویل کرتے ہیں
تیری حکمت کے معترف ہو کر
ذکرِ اصحابِ فیل کرتے ہیں
تجھ کو اچھا گمان بھاتا ہے
خواہشِ سلسبیل کرتے ہیں
تو ہی سنتا ہے استغاثہ بھی
اور تجھی کو وکیل کرتے ہیں
صحنِ کعبہ میں شکر کی خاطر
دیدۂ شوق جھیل کرتے ہیں
نیک اعمال معجزے کی طرح
شخصیت کو جمیل کرتے ہیں

نورین طلعت عروبہ/امریکا

سب کا تو حاجت روا میرے خدا
مالک و مشکل کشا میرے خدا
ہر طرف پھیلی ہوئی ہے دور دور
تیرے جلووں کی ضیا میرے خدا
ثابت و ناقابلِ تنسیخ ہے
تیری قدرت کا لکھا میرے خدا
خلق کا روزی رساں، پروردگار
کون ہے تیرے سوا میرے خدا
بخش اپنی آشنائی کا شرف
اپنی اُلفت کر عطا میرے خدا
محوِ حیرت شاعرِ کوتاہ فکر
کیا کرے تیری ثنا میرے خدا
عیب میرے ڈھانپ رکھ پردہ مرا
میں کہ بندہ ہوں ترا میرے خدا
ہر گلستاں میں تری تقدیس کے
گیت گاتی ہے صبا میرے خدا
صبرِ طالب میں بھی جلتا رہا
تیری وحدت کا دیا میرے خدا
فیصلے اٹل تری تقدیر کے
ہے اٹل تیری رضا میرے خدا
اُس کے قدموں پر زمانہ جھک گیا
جو ترے در پر جھکا میرے خدا
وہ کسی کے خوف میں آتا نہیں
خوف ہے جس کو ترا میرے خدا
محو کر دے خوب میرے ذہن سے
خواہشاتِ ماسوا میرے خدا
کر مجھے اپنے کرم کا واسطہ
قیدِ غفلت سے رہا میرے خدا
گمرہی کے دشت سے محفوظ رکھ
سیدھے رستے پر چلا میرے خدا
مغفرت کا ہوں میں تجھ سے خواستگار
سر سے پا تک ہوں خطا میرے خدا
صرف تیری ایک چشمِ التفات
زخمِ عصیاں کی دوا میرے خدا
ہر مصیبت کا ازالہ تو کرے
ہر مرض کی تو شفا میرے خدا
ہے وہی فخرِ سلاطین و ملوک
جو ترا بردہ ہوا میرے خدا
دائمی خوشیاں میسر ہیں اُسے
جو ترے غم میں مٹا میرے خدا
ہے سوا دامانِ حاجت سے مرے
تیرا فیضانِ عطا میرے خدا
ہے تری تعریف میں رطب اللساں
ارقمِ شیریں نوا میرے خدا

ڈاکٹر محمد افتخار الحق ارقم/گجرات

نعت

آمنہؓ کے نور تیرے سب اُجالے مستقل
ساری باتیں معتبر، سارے حوالے مستقل
اس کے بارے میں رسول اللہ ہی بتلائیں گے
اپنے جلوے میں ہی جو خود کو چھپا لے مستقل
تو تو میری جان ہے، ایمان ہے، ایقان ہے
تو نے بھی تو میرے گھر میں ڈیرے ڈالے مستقل
تو نے بھی تو ہر خوشی کو میرا گرویدہ کیا
میں نے بھی تو غم کے گھیرے توڑ ڈالے مستقل
جب فرشتے اور خدائے پاک ہیں محوِ درود
تو بھی تو اپنی یہی عادت بنا لے مستقل
جب بھی ہو اس کا ارادہ اس کو ہو طیبہ نصیب
کاش کوئی دل کی یہ حسرت نکالے مستقل
وہ مرا روزی رساں ہے آپؐ کی رحمت بھی ہے
آ رہے ہیں، دن بدن، میرے نوالے مستقل
جگنو کے نورِ بریدہ سے ضیا کاری عبث
تاب ناکی کے لیے دل کو جلا لے مستقل
دائیں بائیں دو فرشتے ڈائری لکھتے ہوئے
گھر میں آ بیٹھے ہیں میرے تھانے والے مستقل
میں اُسی آقاؐ کا خادم بن کے جیتا ہوں یہاں
جو مرے کشکول میں خوشیاں اُچھالے مستقل

محمد عباس مرزا/ لاہور

اشکوں کا دعاؤں میں اثر ہونے لگا ہے
طیبہ کا خیالوں میں سفر ہونے لگا ہے
اب نعت کے لکھنے کا سلیقہ بھی عطا ہو
بیدار مرا دستِ ہنر ہونے لگا ہے
یہ ابرِ کرم تھا کہ مدینے کی ہوائیں
بارش کا زمینوں پہ اثر ہونے لگا ہے
آنکھوں میں جو تصویر ہے دربارِ نبیؐ کی
چہرا بھی مرا رشکِ قمر ہونے لگا ہے
جب سے مری پلکوں پہ لگی خاکِ مدینہ
کچھ تیزا مرا نورِ نظر ہونے لگا ہے
باتشؔ کا وطن شمعِ رسالتؐ سے ہے روشن
دشمن بھی ابھی خاک بسر ہونے لگا ہے

ڈاکٹر جاوید باتش/ لاہور

جمالِ محمد ﷺ

مرے سامنے بس جمالِ محمد ﷺ
زمانے میں پھیلے کمالِ محمد ﷺ
بسوئے اُمیہ، ابو بکر رضی اللہ عنہ بولے
ہمارے جنابِ بلالِ رضی اللہ عنہ محمد ﷺ
ابوبکر رضی اللہ عنہ، عثماں رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سب
بنے پیروی میں جمالِ محمد ﷺ
ہمیشہ پریشانیوں میں بچایا
مجھے قبر میں بھی بچا لے محمد ﷺ
بڑے مرتبے عظمتوں خوبیوں میں
سراپا بنے باکمالِ محمد ﷺ
برابر، مقابل، مماثل، بنیں کب
مثال آپ اپنی مثالِ محمد ﷺ
بڑے بادشاہ بارگہ میں مودب
غلامی میں مال و منالِ محمد ﷺ
بسی قلب میں بس تمنائے مدحت
مرے لب پہ مولا مقالِ محمد ﷺ
زمانے میں پاپی نکما برا میں
مجھے کملی میں بھی چھپا لے محمد ﷺ
ملے مدحتِ مصطفےٰ ﷺ میں امینؔ لب
پڑھیں کلمہ پہلا جمالِ محمد ﷺ

محمد امین ساجد سعیدی/ حاصل پور

اس کی ہستی عالی آقا ﷺ
چومے جو بھی جالی آقا ﷺ
نامِ احمد ﷺ کے صدقے سے
بھر دیں خالی تھالی آقا ﷺ
تیری مالا جپتا ہے ہر
بوٹا خوشہ ڈالی آقا ﷺ
اپنے در کے پودوں پر اب
رکھ لیں مجھ کو مالی آقا ﷺ
دے صدقہ کربل والوں کا
لوٹ نہ جاؤں خالی آقا ﷺ
واری ہے جاں غازی نے
اس کا عشق مثالی آقا ﷺ
بن جائے گی بگڑی جب بھی
نظر کرم کی ڈالی آقا ﷺ
آئی کھا کر تیرا لنگر
حالی پر خوشحالی آقا ﷺ

محمد ذوالقرنین جواد حالی/ حاصل پور

غلام محمد قاصر کی تقدیسی شاعری

صبیح رحمانی / کراچی

ہمارے ہاں ابھی کچھ عرصہ پہلے تک یہ تأثر عام تھا اور خاصا محکم بھی کہ تقدیسی شاعری سے دل چسپی رکھنے اور اسے خصوصیت سے اظہار کا وسیلہ بنانے والے شعرا ادب کے مرکزی دھارے سے الگ ہوتے ہیں۔ اس تأثر کی بنیاد میں مختلف قیاسات پائے جاتے ہیں۔ وہ مبنی برحقیقت تھے کہ نہیں، یہ ایک الگ موضوع ہے۔ بہرحال ان میں سے ایک اہم قیاس یا خیال یہ تھا کہ تقدیسی شاعری محض جذبے اور عقیدت کا معاملہ ہے۔ حالاں کہ ساٹھ پینسٹھ برس پہلے محمد حسن عسکری جیسے بلند پایہ مفکر نقاد نے اس مسئلے پر جم کر اظہار کیا تھا اور اس تأثر کو پوری طرح رد کر دیا تھا۔ اس کے باوجود عمومی سطح پر یہ غلط فہمی برقرار رہی تھی۔ ممکن ہے اب بھی کچھ لوگ کسی حد تک اس گم راہی کا شکار ہوں، لیکن ایک بڑے حلقے میں آج اس غلط فہمی کو ہم باآسانی رد ہوتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ شکر کا مقام یہ ہے کہ ہمارے ادب کے مرکزی دھارے میں آج صورتِ حال بالکل بدل چکی ہے، اور اب کتنے ہی نمائندہ تخلیق کار اور خوش فکر شاعر ایسے ہیں جو ادب کی تقدیسی اصناف میں بھی اپنے جوہر کا اظہار التزاماً کرتے ہیں۔ ان کی تقدیسی شاعری بھی اسی درجے کا تخلیقی تجربہ ہے جسے ہم اُن کے ہاں دیگر اصنافِ سخن میں کارفرما دیکھتے ہیں۔

غلام محمد قاصر جدید اردو شعری منظرنامے کا ایک اہم نام ہے۔ ایک ایسا نام جس نے اپنے خوش فکر، خوش رنگ اور خوش آہنگ کلام سے عصری ادبی تناظر میں نہ صرف اپنی جگہ بنائی، بلکہ ایک قابلِ قدر مقام بھی بخوبی حاصل کیا۔ غلام محمد قاصر کے انتقال کو دو دہائیوں سے زائد عرصہ گزر چکا، لیکن ہماری ادبی دنیا میں آج بھی ان کا شعری حوالہ ملتا ہے اور ان کی ادبی شناخت باقی ہے جو یقیناً بڑی خوش کن بات ہے۔ قاصر کی شناخت بنیادی طور پر ایک اچھے غزل گو کی حیثیت سے ہے، اور بجا طور پر ہے۔ تاہم انھوں نے دوسری اصنافِ سخن میں بھی جو طبع آزمائی کی ہے، اہلِ نظر بلاشبہ اس کی بھی داد دیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ کوئی ایک صنف کسی شاعر کے تخلیقی جوہر کے اظہار کا سب سے اہم اور مؤثر ذریعہ ہوتی ہے۔ تاہم یہ بات بھی اصولی طور پر طے ہے کہ ایک اعلیٰ تخلیقی جوہر کا مالک فن کار جس صنف کو بھی اظہار کا ذریعہ بناتا ہے، اس میں اپنے فن اور اسلوب کی ایک سطح قائم رکھتا ہے۔ اس لیے کہ یہ سطح کسی خاص صنف سے مخصوص نہیں ہوتی، بلکہ بنیادی طور پر اس کے تخلیقی جوہر سے تعلق رکھتی ہے۔ چناں چہ اس کے اظہار کے ہر تخلیقی وفنی دائرے میں اپنا سراغ دیتی ہے۔

آپ غلام محمد قاصر ہی کی مثال لے لیجیے۔ قاصر نے غزل کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں بھی اپنی قدرتِ کلام کا اظہار کیا۔ انھوں نے غزل کے ساتھ نظم بھی کہی۔ اس کے علاوہ حمد، نعت، منقبت، مرثیہ اور سلام بھی لکھا۔ ان سب اصناف میں دیکھا جاسکتا ہے کہ قاصر کا تخلیقی جوہر کم وبیش ایک متعین سطح پر خود کو آشکارا کرتا ہے۔ اس کی فکر، شعور، ادراک، فن کارانہ حسیت اور تخلیقی اسلوب ہر جگہ اپنے ہونے کا پتا دیتا ہے۔ اس کا تخلیقی وفور جس صنف میں بھی راہ پاتا ہے، اس کی کیفیت اور سطح آسانی سے پہچانی جاسکتی ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ ہر جگہ یکساں طور پر سامنے آتا ہے اور کسی بھی جگہ اس میں سرِمو کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ یہ فطری امر ہے کہ کچھ نہ کچھ تفاوت ہو۔ وہ تو ایک ہی شاعر کی مختلف غزلوں یا نظموں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، لیکن اس کا تخلیقی شعور اور فن کارانہ اسلوب اپنی ایک حد سے نیچے بہرحال نہیں آتا۔ لہٰذا اس کے ہاں تخلیقی سطح کا ایک نشان صاف طور پر ہمارے سامنے آتا اور ہر صنف میں برقرار رہتا ہے۔

غلام محمد قاصر کی تقدیسی شاعری میں بھی اس کی غزل اور نظم کی طرح ہمیں جدید حسیت کارفرما نظر آتی ہے۔ جدید عہد کے انسان کی صورتِ حال، اس کے مسائل، اس کی ذہنی دنیا، اس کے عصری حقائق اور اس کے انسانی تجربات اور ان تجربات کے نتیجے میں تشکیل پانے والے جذبہ واحساس کو غلام محمد قاصر کی حمد، نعت، منقبت اور سلام میں یعنی اس کے ہر نوع کے شعری تجربے میں منعکس ہوتے ہوئے بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس نکتے کو ایک مثال کے ذریعے واضح کرتا ہوں۔ اہلِ نظر کا کہنا ہے کہ جدید عہد کے انسان کی زندگی کا منظرنامہ تضاد وتخالف کے رشتے میں سب سے بڑھ کر اپنا اظہار کرتا ہے۔ دیکھیے غلام محمد قاصر کے یہاں اپنے عہد کی اس حقیقت کا یہ پہلو حمد کے اشعار میں کس طرح ابھرتا ہے:

خندۂ گل ہی پہ موقوف نہیں یہ خوش بو
تیرا پیغام تو اشکوں کی زبانی بھی ملے

ظرفِ سائل کو بناتا ہے عطا کا معیار
کہیں صرصر تو کہیں موجِ صبا دیتا ہے

حمد کا پھول سرِ شاخِ یقیں دیکھ کے دل
وہم کے سارے پرندوں کو اڑا دیتا ہے

ان اشعار میں خندۂ گل اور اشکوں کی زبانی، کہیں صرصر اور کہیں موجِ صبا، شاخِ یقیں اور وہم کے پرندوں کے تضاد میں شعر کے معنی بھی سامنے آتے ہیں اور اس دور کی انسانی صورتِ حال اور اس کے ذہنی رویے بھی۔

اب دیکھیے نعت کے پیرایے میں یہی اندازِ نظر اس

طرح ہمارے سامنے آتا ہے:

ظلمات میں کھو جاتے، ہم لوگ بھی سو جاتے
صد شکر ضمیروں میں بیدار مدینہ ہے

غم کے ظلمات میں شاداب جزیروں کا نشاں
وہ سفینہ جو ترے حکم کی تعمیل کرے

شامِ غم میں، سحر اداس، کوئی نہیں ہے آس پاس
ہاں وہ رسولِ اوّلیں لایا جو آخری کتاب

درجِ بالا نعت کے اشعار میں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ تضاد سے اثباتی جہت سامنے آ رہی ہے۔ یہاں اس امر پہ بھی توجہ کی ضرورت ہے کہ یہ صفتِ تضاد صرف لطفِ بیاں کا ذریعہ نہیں، بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر معنوی تشکیل کا کام بھی کر رہی ہے۔

غلام محمد قاصر کی شاعری میں دقیق مضامین اور فلسفیانہ خیالات نہیں ملتے۔ اس کے ہاں جذبہ نمایاں ہے۔ تاہم جب اس کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے اور اس کی شاعری میں راہ پانے والے اظہار کے قرینوں اور بیان کیے گئے مضامین پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جذبے کی فراوانی بے شک اس کے ہاں باقی سب چیزوں سے بڑھ کر نمایاں ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ شاعر کی نگاہ ہست و بود کے گہرے حقائق پر بھی بڑی خوبی سے پڑتی ہے اور وہ بھی اس کے شعری اظہار میں در آتے ہیں۔ اس کے علاوہ قاصر کی نعت نگاری میں ہمیں رسالت مآب ﷺ کی تعلیمات کے مختلف حوالے بھی ملتے ہیں جو اس کے شعور پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور ان سب کے ساتھ ساتھ وہ اس کائنات کے مظاہر اور مشیتِ الٰہی کے بارے میں بھی سوچتا ہے۔ ان کے معانی پر غور کرتا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کی زندگی کے معمولات بھی اس کے لیے گہرے افکار کا مفہوم واضح کرتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھیے:

تیری سیرت کو ترے عہد کو سمجھا ہی نہیں
جو کسی دور کے انسان کی تذلیل کرے

پتھر بندھے ہیں پیٹ پہ سوئے ہیں خاک پر
قدموں میں کہکشائیں لیے آسماں بھی ہیں

ملے انھی سے ہر اک سلسلہ محبت کا
جو اپنے دشمنِ جاں کو معاف کرتے ہیں

سرائے دہر میں مہمان تھے صدیوں کے سناٹے
تمھارا نام۔ لے کر کارواں اُترے اذانوں کے

ہر ایک تہذیب سے گزر کر جہاں کے دانش وروں نے جانا
تمام دانائیوں کا مرکز تمام حکمت کا گھر مدینہ

فکر و احساس کی اسی دنیا میں جینے اور حقائقِ حیات سے آگہی کے اسی سفر کا عمل پھر غلام محمد قاصر کو اس مقام پر لاتا ہے جہاں پہنچ کر وہ حرفِ نعت کی تخلیق کے شعور سے بہرہ مند ہوتا ہے اور اس کے لیے اصول بیان کرتے ہوئے پورے تیقن اور گہرے تخلیقی شعور کے ساتھ نہایت شائستہ اور محکم لہجے میں کہتا ہے:

دن کو دن رات کو جو رات نہیں لکھ سکتا
ایسا فن کار کبھی نعت نہیں لکھ سکتا

اس مجموعے میں اہلِ بیتِ کرام کے لیے لکھے گئے مناقب و سلام بھی شامل ہیں۔ ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قاصر نے ان برگزیدہ شخصیات سے اپنی محبت اور عقیدت کے اظہار کا قرینہ بے شک جذبے سے مملو رکھا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت، سیرت، کردار، عمل اور ان کی تعلیمات پر بھی اس کی پوری توجہ رہتی ہے۔ یہ قرینہ اس امر کا غماز ہے کہ قاصر کا شعری مزاج اس حقیقت کا نہ صرف ادراک رکھتا ہے، بلکہ اس کی قدر و منزلت بھی اچھی طرح سمجھتا ہے کہ شاعر کے جذبے کا وفور ہی سب کچھ نہیں ہوتا، بلکہ بہتر سطح کے شعری اظہار کے لیے حقائق اور واقعاتی صداقت سے آگاہی بھی از حد ضروری ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ بلند مرتبہ شخصیات اپنی سیرت ہی کی بدولت مثال کے درجے میں ہیں اور ان کی عظمت کے سارے حوالوں میں ان کے کردار کا حسن ہی سب سے نمایاں ہے۔ اس لیے ان سے محبت کا اظہار دراصل ان اصولوں سے بھی محبت کا پہلو رکھتا ہے جن کو ان بلند پایہ ہستیوں نے ہمیشہ اپنی متاعِ جاں گردانا۔

کہیں شجاعت، کہیں سخاوت، کہیں عدالت
سبھی حوالے اسی امامت کے نام آئے

جو پیاس وسعت میں بے کراں ہے سلام اُس پر
فرات جس کی طرف رواں ہے سلام اُس پر

گو قلم ہوتے گئے لیکن علم ہوتے گئے
جھک نہیں سکتے تری تائید میں اٹھے جو ہاتھ

مشہدِ دل سے مالِ غنیمت لوٹنے والوں کو
زخم، دعائیں، شکر، مصلّے اور قرآن ملا

خاک نے چومے زخم تو آگ نے بڑھ کے طوافِ خیام کیا
سبطِ نبی کی تنہائی کو ہر عنصر نے سلام کیا

غلام محمد قاصر کا شعری اسلوب اپنی ایک خاص جاذبیت اور دل کشی رکھتا ہے۔ اس میں شاعرانہ لطافت کے ساتھ گہرے ادراک کا عنصر بھی شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاصر کی شاعری صرف ہمیں سننے سنانے کے لطف سے بہرہ مند نہیں کرتی، بلکہ سوچنے اور سمجھنے کی دعوت بھی دیتی ہے۔ اس کی تقدیسی شاعری کا یہ مجموعہ اگرچہ مختصر ہے، لیکن اس میں شاعر کے تخلیقی جوہر کا حسن اور فن کارانہ صلاحیت کا عمل پوری طرح نمایاں ہیں۔ میرے نزدیک اس مجموعے کی اشاعت معاصر شعری منظرنامے کے لیے تقویت کا سامان ثابت ہوگی، خصوصاً تقدیسی شاعری کے حوالے سے۔

''ہم بھی وہاں موجود تھے''

جمیل یوسف/مری

جب جناب جنرل عبدالمجید ملک صاحب کی خودنوشت داستانِ حیات ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' کا نام سننے میں آیا تو معاً مجھے پیرومرشد سید ضمیر جعفری مرحوم کا وہ جملہ یاد آ گیا جو انہوں نے مشہور مزاح نگار کرنل محمد خان کے مجلّے اردو پنچ کے پہلے شمارے پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ کہا تھا ''آپ نے تو قارئین کا آدھا دل رسالے کے نام اور سرورق سے ہی موہ لیا ہے۔''

محترم جناب عبدالمجید ملک نے اپنی کتاب کی نصف کامیابی تو اس کے نام سے ہی حاصل کر لی ہے۔ ''ہم بھی وہاں موجود تھے'' کسی بھی خودنوشت سوانح عمری کا ایک نہایت خوبصورت اور معنی خیز نام ہے۔ آپ نے ابن انشاء کے یہ مشہور بلکہ زبان زدِ خاص و عام اشعار ضرور سنے ہوں گے:

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرا ترا
ہم بھی وہاں موجود تھے، ہم سے بھی سب پوچھا کیے
ہم ہنس دیے، ہم چپ رہے، منظور تھا پردا ترا

مگر جنرل عبدالمجید ملک صاحب چپ نہیں رہے۔ نہ انہیں کسی کا پردا منظور تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں جو کچھ دیکھا اور جو کچھ سنا، سب کچھ برملا لکھ دیا ہے۔ البتہ اگر کچھ کلام ہو سکتا ہے تو اس کام میں جو انہوں نے کیا ہے یا نہیں کیا ہے۔

ماشاء اللہ اب جنرل صاحب کی عمر عزیز ۹۵ سال کے لگ بھگ ہے۔ ان کی خودنوشت کم و بیش پچھلے ۷۵ سال پر پھیلی ہوئی طویل کہانی ہے جسے انہوں نے کہیں تفصیل اور کہیں اجمال کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یہ صرف ان کی ذاتی کہانی نہیں ہے بلکہ پچھلے ۷۵ سال میں یعنی ۱۹۴۰ سے لے کر جب وہ بیس اکیس سال کے تھے، ۲۰۱۵ء تک کہ اب وہ ۹۵ سال کے ہیں۔ جو کچھ ان پر گزری اور جو کچھ اُن جیسے جرنیلوں اور سیاست دانوں کے ہاتھوں وطن عزیز پاکستان پر گزری ہے اس سب کا حال ہے۔ شاید ہی اس وقت پاکستان میں جنرل عبدالمجید ملک صاحب سے زیادہ طویل العمر کوئی اور بزرگ سیاستدان ہو جس نے نہ صرف تحریک پاکستان کے آخری مراحل، ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک اور قیام پاکستان کے بعد سے لے کر اب تک کے واقعات کو اتنے قریب سے دیکھا ہو اور پاکستانی فوج کے اندرونی رازوں سے بھی اس قدر آگاہ ہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ جنرل صاحب نے ان حالات و واقعات کی تشکیل پذیری میں بھی بالخصوص ۱۹۸۵ء سے لے کر ۲۰۱۳ء تک کبھی سامنے اور کبھی پس پردہ عملی کردار بھی ادا کیا ہے اس لیے اُن کی یہ خودنوشت پاکستان کی تاریخ کا ایک مستند حوالہ بھی ہے۔ اُن کے بیان کی تفصیل اور بعض مقامات پر ان کا اختیار کردہ اختصار، دونوں بہت کچھ بتاتے ہیں۔

جناب جنرل عبدالمجید ملک کو یہ منفرد اعزاز بلکہ افتخار بھی حاصل ہے کہ وہ پاکستان کے اکلوتے جرنیل ہیں جنہوں نے فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد بغیر کسی حکومتی تائید و حمایت کے اور بغیر کسی قسم کے سیاسی پس منظر کے، عملی سیاست میں قدم رکھا اور اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیے۔ اپنے حلقہ انتخاب سے جنرل صاحب ایک دو دفعہ نہیں بلکہ پورے پانچ دفعہ قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ہیں۔ متعدد بار وفاقی وزیر کے عہدے پر متمکن رہے ہیں۔ جب وہ وفاقی وزیر خوراک و پیداوار تھے یو این او کے عالمی ادارے ایف اے او (فوڈ اینڈ ایگری کلچر آرگنائزیشن) کے روم میں منعقدہ سالانہ اجلاس کے صدر چنے گئے اور اس حیثیت میں پاپائے روم نے انہیں ملاقات کی دعوت دی۔ یہ اعزاز پاکستان کے کسی اور وزیر، سفیر یا جرنیل کو نہیں ملا۔

پاک فوج کے جرنیلوں میں بھی جنرل عبدالمجید ملک صاحب کو یہ منفرد امتیاز حاصل ہے کہ جب ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ہمارے سارے جرنیل سر بہ زانو تھے اور جنرل یحییٰ اور جنرل نیازی ہتھیار ڈالنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے جنرل عبدالمجید ملک نے حسینی والا سیکٹر میں دفاعی پوزیشن سے خود اپنے طور پر آگے بڑھ کر بھارتی علاقے پر یلغار کر دی اور دشمن کے علاقے میں گھس کر اچانک حملہ کر کے بھارت کے قیصر ہند نامی قلعے پر قبضہ کر لیا۔ وہاں موجود بھارتی فوجیوں کے پاس بدحواسی میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ رہا۔ جنرل عبدالمجید ملک نے بھارت کے قیصر ہند قلعے پر پاکستانی پرچم لہرا دیا۔ پھر جب ۱۹۷۲ء میں جنرل صاحب کو جی او سی ۱۲ ڈویژن مری لگایا گیا تو انہوں نے ایک اور بہادری اور جرأت کا کارنامہ سرانجام دیا۔ ہوا یوں کہ ابھی وہ مری پہنچے ہی تھے اور ابھی انہوں نے اپنی کمان سنبھالی بھی نہ تھی کہ بھارتی فوج نے گزشتہ رات آزاد کشمیر میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر واقع پاکستان کی تین فوجی چوکیوں پر اچانک حملہ کر

کے قبضہ کرلیا اور ہمارے کئی فوجی جوانوں کو شہید کر دیا۔ جنرل صاحب اُسی دن اپنی فوجی چوکیاں بھارت کے قبضے سے چھڑانے پر کمربستہ ہو گئے۔ ان دنوں ہماری فوج کا مورال ڈاؤن تھا۔ ۱۹۷۲ء کی جنگ میں عبرتناک بلکہ شرمناک شکست کے نتیجے میں ہمارے پچاس ساٹھ ہزار فوجی اپنے کاغذی ٹائیگر جنرل نیازی کے حکم پر بھارت کے قیدی بن چکے تھے بھارتی فوجی اونچی ہواؤں میں تھے۔ اسی برتری کے زعم میں انہوں نے کشمیر میں پیش قدمی کر کے تین پاکستانی چوکیوں پر اچانک حملہ کر کے قبضہ کرلیا تھا۔ جنرل عبدالمجید ملک کا موقف یہ تھا کہ فوری طور پر ایکشن لیا جائے اور بھارتیوں کو ان چوکیوں سے مار بھگایا جائے ورنہ ہماری فوج میں مزید بددلی اور مایوسی پھیلے گی۔ اس وقت کے کمانڈر انچیف کے تحفظات کی پروا نہ کرتے ہوئے جنرل عبدالمجید ملک نے مظفرآباد میں اپنے فوجی دستوں کو فی الفور ایکشن کارروائی کا حکم دیا۔ خود آپریشن کی نگرانی کی۔ اگلی صبح جب بھارتی فوجی ابھی جاگے بھی نہ تھے ہمارے مجاہدان کے سروں پر پہنچ گئے اور وہ دو تین لاشیں چھوڑ کر سرپٹ بھاگ کھڑے ہوئے۔ تینوں چوکیوں پر پاکستان کا قبضہ بحال کر دیا گیا۔ اس دوران دہلی سے مقبوضہ کشمیر کی ہائی کمان کو بھیجا گیا ایک سگنل پیغام پکڑا گیا جس میں بھارتی کمانڈر کو خبردار کیا گیا تھا کہ مری میں جو نیا جی او سی آیا ہے یہ وہی جنرل ہے جس نے قیصر ہند قلعے پر حملہ کیا تھا۔ اس لیے محتاط اور چوکس رہو۔

جنرل عبدالمجید ملک کی آپ بیتی میرے لیے اس لیے بھی خصوصی دلچسپی کا موجب ہے کہ جنرل صاحب میرے گرائیں ہیں۔ ان کا گاؤں جنڈ میرے آبائی گاؤں لنگاہ سے صرف دو ڈھائی کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ لنگاہ وہی گاؤں ہے جس کے بارے میں کرنل محمد خان نے لکھا ہے کہ یہ قصبہ بڑا مردم خیز اور زن شناس ہے۔ جنرل صاحب سے محبت کا ایک اور رشتہ بھی ہے وہ میرے والد گرامی قابل صد احترام شیخ محمد یوسف مرحوم کے شاگرد بھی رہے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک شام جب سینیٹر جنرل عبدالقیوم مجھے چکوال میں جنرل عبدالمجید ملک صاحب کے گھر لے گئے تو میں نے کہا میرے شاگرد مجھے میرے ابا جی کے شاگرد سے ملنے لائے ہیں۔ جنرل عبدالقیوم پر مجھے فخر ہے۔ ان کے کالموں کے مجموعے فکر و خیال میں ان کے بارے میں میرا مضمون پڑھیں۔

میں جنرل عبدالمجید ملک صاحب کو ذاتی طور پر ۱۹۶۷ء سے جانتا ہوں۔ جب وہ پشاور میں کرنل سٹاف تھے۔ ان دنوں میری پوسٹنگ بھی پشاور میں تھی۔ پھر جب ۱۹۷۵ء میں دوبارہ میں پشاور پوسٹ ہوا تو جنرل صاحب پشاور میں کور کمانڈر تھے۔ جنرل صاحب خاصا شستہ ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ انہیں متعدد اشعار یاد ہیں۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی میں اپنے اردگرد کے ماحول کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا ہے۔ اپنی جوانی کے زمانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارا علاقہ اگرچہ مسلم اکثریتی علاقہ تھا۔ مگر ہر گاؤں میں دو یا تین ہندوؤں اور سکھوں کے گھر ضرور تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے تجارت پر اجارہ داری حاصل کر رکھی تھی اور مسلمان اکثر اوقات ان کے مقروض اور مرہونِ احسان ہی رہتے۔ کسی بھی گاؤں میں ان غیر مسلموں کے گھر معاشی طور پر مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر ایک بات جس کا ذکر میں ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہندو اور سکھ اور مسلمان، ان تینوں کے درمیان جو افہام و تفہیم تھی اس کی صورتِ حال موجودہ صورتِ حال سے بہت بہتر تھی جو کہ اب مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اس زمانے میں نہ اتنے عالم تھے اور نہ اتنی کتابیں۔ سیدھے سادے مسلمان تھے جن میں بغض اور نفاق کا شائبہ تک نہ تھا۔ عبادت گاہوں میں بھی کسی ایسے پہلو کا ذکر نہیں کیا جاتا تھا جس سے فرقہ واریت کا اظہار ہو۔ لوگوں کے عقائد پر کوئی سوالیہ نشانات نہیں تھے۔ لوگوں کا ایمان اور عقیدہ سادہ مگر مضبوط تھا اور اس میں کوئی پیچیدگی یا ملاوٹ نہیں تھی۔ اس دور کے سادہ طرزِ زندگی میں برداشت کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ وہ دور نہایت پرسکون دور تھا۔ وسائل نہ ہونے کے باوجود لوگ مطمئن تھے..... اُس دور میں سارے معاشرے اور ماحول پر ایک خاص قسم کی معصومیت اور سادگی کی فضا غالب تھی۔ دیہات میں خواتین ظاہری پردہ نہیں کرتی تھیں مگر ان کی آنکھوں میں موجودہ زمانے والی بے باکی کے بجائے حیا کا عنصر موجود تھا اور مرد بھی صحیح معنوں میں خواتین کا احترام کرتے تھے۔ کیا مجال جو کوئی مرد کسی کی بہن بیٹی کو آنکھ اُٹھا کر غلط نگاہ سے دیکھے۔ اکثر گھروں کی چار دیواری نہیں ہوتی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کے صحن سے گزرتے رہتے تھے لیکن کسی کو کوئی شکایت ہوتی تھی اور نہ ہی کوئی غیر اخلاقی اور غیرت کا مسئلہ پیدا ہوتا تھا۔ اگر کبھی بدقسمتی سے کسی گاؤں میں کوئی لڑائی یا جھگڑا ہو جاتا تو اس میں صرف ڈانگ ہی چلتی، وہی اُس دور کی کلاشنکوف تھی..... صبح سویرے کسان اور دوسرے پیشوں کے لوگ جلدی جاگ اُٹھتے تھے۔ کسان کھیتوں میں ہل چلانے جاتے اور دن کے دس گیارہ بجے انہیں گھر سے روٹی اور لسی وغیرہ بھیجی جاتی۔ دوپہر

کو ہانڈی پکانے کا سلسلہ بالکل نہیں تھا اور نہ ہی چائے کا رواج تھا۔ بلکہ چائے نام کی چیز سے لوگ بالکل ہی ناواقف تھے۔ سب لوگ دن میں عام طور پر صرف دو بار ہی کھانا کھاتے تھے۔'' جنرل صاحب ۱۹۶۵ء کی جنگ کا حال لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اختر ملک پاکستان کے ایک بڑے باہمت جرنیل تھے جو چھمب جوڑیاں آپریشن کے انچارج تھے۔ اختر ملک نے چند روز میں حیرت انگیز حد تک کامیابی حاصل کی اور دریائے توی تک جا پہنچے۔ مگر عین اس وقت جب کہ اختر ملک کا اگلا قدم کامیابی اور کامرانی کی منزل پر پڑنے والا تھا اور اکھنور پر قبضہ یقینی نظر آ رہا تھا اس موقع پر صدر ایوب خان سے ایک بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی۔ اس نے ۱۲ ڈویژن کی کمان اختر ملک کے بجائے جنرل یحییٰ خان کو سونپ دی۔ جنگی حکمت عملی اور منصوبہ سازی کے لحاظ سے کسی بھی آپریشن کے دوران اُس کمانڈ کی تبدیلی جو کامیابی کی طرف گامزن ہو، اس کی مثالیں عسکری تاریخ میں بہت ہی کم ملتی ہیں۔ یہ عمل Changing horses in the middle کہلاتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ فیصلہ ہے جس کے مثبت نتائج نکلنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تصور کیے جاتے ہیں۔ ۱۲ ڈویژن کی قیادت کی اس تبدیلی کے دوران کمانڈرز کے چارج کے ہینڈنگ ٹیکنگ اوور کے عمل کے باعث ۲۴ سے ۴۸ گھنٹے کی جو تاخیر ہوئی، انڈین آرمی نے اس کا بھرپور فائدہ اُٹھایا اور دریائے توی کے اُس پار ان کو اپنی دفاعی پوزیشن مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہ تبدیلی نہ ہوتی تو اکھنور پاکستان کی گرفت میں تھا۔''

جنرل صاحب نے اس بات کا تذکرہ نہیں کیا کہ صرف کمان کی تبدیلی میں ہی قیمتی اور فیصلہ کن وقت ضائع نہیں ہوا بلکہ کمان سنبھالنے کے بعد براستہ گجرات محاذ جنگ پر جاتے ہوئے یحییٰ خان نے راستے میں اپنی داشتہ اقلیم اختر عرف جنرل رانی کے کوٹھے پر پڑاؤ ڈال دیا اور اپنی فرضی فتح کا جشن منانے میں مگن ہو گیا۔ شراب و شباب سے بڑھ کر اسے اور کوئی شے مرغوب نہ تھی۔

جنرل عبدالمجید ملک صاحب نے ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کا ذکر کرتے ہوئے یہ نہیں لکھا کہ آپریشن کی کامیاب پیش رفت کے دوران کمان کی تبدیلی کا احمقانہ اور ملک دشمن عمل پھر دہرایا گیا اور اس بار خود جنرل یحییٰ نے جو زبردستی کا صدر پاکستان بنا بیٹھا تھا۔ مشرقی پاکستان کے محاذ پر جنرل ٹکا خان کی جگہ جنرل نیازی کو بھیج دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو مشرقی پاکستان میں پاک فوج کو شرمناک شکست سے دوچار کرانے کا اس کا منصوبہ ناکام ہو جائے۔ کیونکہ اس محاذ پر ذلت آمیز شکست اور مشرقی پاکستان کی علاحدگی کے بغیر یحییٰ کے تاحیات صدر اور بھٹو کے تاحیات وزیراعظم بنے رہنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ یہی ان دونوں کا پلان تھا۔ بعد میں بھٹو کو یعنی الیکشن ۱۹۷۰ء میں ہارے ہوئے شخص کو جب یحییٰ نے اپنا نمائندہ بنا کر یو این او بھیجا تو وہ فوری طور پر سیدھا نیویارک پہنچنے کی بجائے بیماری کا بہانہ بنا کر لندن میں بیٹھا رہا کہ ڈھاکہ پر جب بھارتی فوج کا قبضہ ہو جائے تو پھر وہ اقوامِ متحدہ پہنچے۔ آخر جب وہ وہاں پہنچا تو اس وقت سیکورٹی کونسل کے اجلاس میں پولینڈ کی پیش کردہ قرارداد (نمبر 307) پر بحث ہو رہی تھی۔ اس قرارداد کی رو سے جنگ بندی ہو جاتی اور دونوں طرف کی فوجیں جنگ سے پہلے والی پوزیشنوں پر چلی جاتیں۔ مگر یہ بات نہ بھٹو کو منظور تھی اور نہ اس کے باس یحییٰ کو۔ چنانچہ بھٹو نے اس قرارداد کو پاکستان کی طرف سے منظور کرنے کی بجائے اسے پھاڑ کر فرش پر پھینک دیا اور اجلاس سے واک آؤٹ کر گیا۔ اُس نے کہا "I am wasting my time here" (دیکھیے صفحہ ۱۱۴، ۱۱۵)

بھٹو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ڈھاکہ پر بھارتی فوج قبضہ کر چکی تھی۔ پولش ریزولیشن کو بروئے کار لا کر بھارتی فوج کا قبضہ ختم کرانے کے بجائے بھٹو کو تو واپس اسلام آباد پہنچ کر بچے کھچے پاکستان کا اقتدار سنبھالنا تھا۔ وہ واقعی نیویارک میں اپنا وقت ضائع کر رہا تھا۔ اسی سچائی کو چھپائے رکھنے کے لیے تو اس کے اقتدار سنبھالنے کے بعد جنرل یحییٰ کو نظر بند کر دیا گیا تھا تاکہ اس کی زبان بند رہے۔ نہ اس کا ٹرائل ہوا اور نہ حمود الرحمان کمشن کی رپورٹ شائع کی گئی۔

اب جنرل عبدالمجید ملک صاحب کی داستانِ حیات کی طرف لوٹتے ہیں۔ جنرل صاحب نے فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد جب سیاست میں قدم رکھا تو بلاشبہ قدم قدم پر حیران کن اور بے مثال کامیابیاں حاصل کیں۔ یہ ان کی زبردست حکمت عملی، منصوبہ بندی، عزمِ صمیم اور انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ان مراحل کا انہوں نے بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ چکوال میں مدتوں سے مسلط سردارانہ جاگیرداری نظام کے خلاف اُٹھے تھے اور انہوں نے نہایت کامیابی سے اس ظالمانہ تسلط کے بخیے اُدھیڑ کر رکھ دیے۔ مگر افسوس صد افسوس کہ جنرل صاحب بھی آخر میں پاکستان کے روایتی سیاست دانوں کی طرح مصلحت اور مفاد پرستی کا شکار ہو گئے اور اقتدار کی ہوس میں انہی سرداروں اور جاگیرداروں سے سمجھوتہ اور اتحاد کر لیا

جن کے خلاف اُٹھے تھے۔ کتاب کے صفحہ نمبر ۲۷۲ پر خود لکھتے ہیں:

''کچھ حلقوں نے کہا کہ جنرل صاحب نے ضلع چکوال سے سرداری نظام کے جس پودے کو اکھاڑنے کا عزم کیا تھا، اس کو ایک مرتبہ پھر پانی دے کر ہرا کر رہے ہیں۔ میرے کچھ قریبی دوستوں نے بھی سردار گروپ سے سیاسی الحاق کی کڑوی گولی نگلنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی۔ مگر ہم حالات وواقعات کے تناظر میں یہ سب کچھ کر گزرے۔'' جنرل صاحب نے یہ واضح نہیں کیا کہ یہ تناظر کیا تھا اور ہر قیمت پر اقتدار کے حصول کی اس بھونڈی کوشش کا آخر کیا جواز تھا۔ نہ اپنے قریبی حلقوں کا صائب مشورہ اور نہ غیروں کی کڑی تنقید، ان کو مفاد پرستانہ اقدام سے باز رکھ سکی۔ وہ خالص جمہوری عمل سے وفاقی وزارتوں تک پہنچے تھے۔ مگر اب انہوں نے فوجی ڈکٹیٹر جنرل مشرف کے حواریوں کے گھٹنے چھونے شروع کر دیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جب کسی چیز کے حصول کا پختہ ارادہ کر لیتے ہیں تو کسی رکاوٹ سے نہیں رُکتے۔ مگر ان کے اس ثابت شدہ رویے اور طرزِ عمل کی روشنی میں چکوال ریلوے لائن اُکھاڑے جانے کے حوالے سے ان کا یہ بیان قاری کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب مندرہ بھون ریلوے سروس کا خاتمہ ہوا تو میرے مخالفین نے اس معاملے کو بہت اُچھالا اور مجھے بلاوجہ اس کا قصوروار گردانا گیا۔ میرے لیے ضروری ہے کہ میں ریلوے کے اس معاملے کے حقائق واضح کروں۔ اصل صورتحال یہ تھی کہ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں پاکستان ریلوے کا محکمہ اچانک خسارے میں چلا گیا (جنرل صاحب نے اس کے اسباب بیان نہیں کیے)۔ ریلوے نے ملک بھر میں ان ریلوے لائنز کا جائزہ لیا جو اس خسارے کا باعث تھیں (کوئی ریلوے لائن خسارے کا باعث نہیں تھی۔ یہ سب ریلوے حکام کی ٹرانسپورٹ مافیا کے ساتھ ملی بھگت کا نتیجہ تھا)۔ بدقسمتی سے مندرہ چکوال بھون ریلوے لائن مذکورہ خسارے کے حساب سے سرفہرست تھی۔ مجھے جب اس بات کا علم ہوا کہ پاکستان ریلوے کا محکمہ مندرہ چکوال لائن کی بندش کے بارے میں سوچ رہا ہے تو میں نے وزارتِ ریلوے اور دیگر حکام سے دو دفعہ رابطہ کیا۔ تو انہوں نے دونوں مرتبہ حقائق اور اعداد و شمار پیش کر کے ایسے ٹھوس دلائل دیے جن کو رد کرنا ممکن نہ تھا۔ ریلوے حکام نے آخری اجلاس میں جب ہمارے سامنے اپنے اعداد و شمار رکھے تو ہم لاجواب ہو گئے۔'' (صفحہ ۳۰۳)

یہ اندازِ بیان ہی چغلی کھا رہا ہے جناب جنرل صاحب! آپ اتنی آسانی سے لاجواب کیسے ہو گئے۔ آپ نے ریلوے حکام کو یہ کیوں نہ بتایا کہ مندرہ چکوال ریلوے لائن کے خسارے کی اصل وجہ یہ تھی کہ چکوال کی ٹرانسپورٹ مافیا سے ملی بھگت کر کے محکمہ ریلوے نے گاڑی کے اوقات ایسے رکھے ہوئے تھے کہ لوگ اس پر سفر نہ کر سکیں۔ گاڑی صبح تین بجے چکوال سے راولپنڈی کے لیے چلائی جاتی تھی اور اہتمام یہ کیا گیا تھا کہ آٹھ نو بجے یعنی پانچ چھ گھنٹے بعد راولپنڈی پہنچے۔ پھر اسے لیٹ کر کے مزید دیر سے پہنچنے کے ہتھکنڈے بھی تھے۔ اس سازش سے ریلوے سسٹم کو جان بوجھ کر تباہ کیا گیا۔ کیا آپ اس سے بے خبر تھے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جب ۱۹۷۲ء میں بھٹو وزیراعظم بنا اور اس نے جہلم کے انتخابی حلقے سے تعلق رکھنے والے ممبر قومی اسمبلی جناب ڈاکٹر غلام حسین کو وزیر ریلوے بنایا تو ڈاکٹر صاحب کے حکم پر چکوال ریلوے نے اپنے اوقات کا شیڈول بدلا۔ ٹرین صبح چھ بجے چکوال سے راولپنڈی کے لیے روانہ ہونے لگی اور دو گھنٹے میں یعنی آٹھ بجے راولپنڈی پہنچنے لگی تھی۔ مسافروں کا اتنا رش ہو گیا کہ ٹرین کھچا کھچ بھری ہوئی ہوتی تھی۔ بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ آپ نے ریلوے حکام کو از سرِ نو ڈاکٹر غلام حسین کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی ہدایت کیوں نہ کی۔ آپ نے قارئین کو یہ بھی نہیں بتایا کہ ریلوے کی بندش سے فائدہ کس نے اُٹھایا۔ ٹرانسپورٹ مافیا اور اڈہ مافیا کے مالکان کون ہیں۔ چکوال ریلوے کی طرح میونسپل کمیٹی کے بنائے ہوئے وسیع و عریض اڈے کو بھی کیوں ناکارہ بنا کر رکھ دیا گیا؟ جنرل صاحب کو اس پر بھی کچھ روشنی ڈالنی چاہیے تھی۔

افسوس صد افسوس ہم نے ایک سو سال سے رواں دواں ریل گاڑی نہ صرف بند کر دی اور عوام کو ایک بہتر پرسہولت اور دل خوش کرنے والے سفر سے محروم کر دیا بلکہ ریل کی پٹڑیاں بھی اُکھاڑ کر لے گئے۔ تاکہ ریلوے سروس کی بحالی کا خدشہ نہ رہے۔ بے چارے لوگ ویگنوں اور بسوں میں دھکے کھاتے پھریں اور اپنے گوڈے چھلواتے رہیں۔ کیونکہ ہم نے تو ٹرانسپورٹ مافیا اور اڈہ مافیا کی تجوریاں بھرنی تھیں۔ یہ ظلم اور قومی وسائل پر یہ ڈاکہ تو سرداروں کے دور میں بھی نہیں پڑا تھا۔ معلوم نہیں ہم خدا کو کیا جواب دیں گے۔

عبدالعزیز جاوید: شہرت سے بے نیاز عبقری

ڈاکٹر مختار عزمی/لاہور

اگر کوئی پوچھے کہ ''فی زمانہ ایک سچا پاکستانی مسلمان استاد کیسا ہونا چاہیے؟''۔ میرا فی البدیہہ جواب ہوگا، پروفیسر عبدالعزیز جاوید۔ یہ سطور اسی مثالی پاکستانی مسلمان استاد، ادیب، شاعر، محقق اور مترجم کی بارگہِ عظمت میں معمولی نذرانہ عقیدت ہیں۔ یہ میرے ذاتی مطالعے، مشاہدے اور تجربے کا ماحصل ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے :

یک زمانہ صحبتے با اولیا
بہ از صد سالہ طاعتِ بے ریا

10 مارچ 1979ء کی وہ سہانی صبح مجھے ہمیشہ یاد رہے گی جب میں نے خواجہ فرید گورنمنٹ کالج رحیم یار خاں میں بہ طور لیکچرر اردو، جوائن کیا۔ جناب عبدالعزیز جاوید نے بہ طور وائس پرنسپل میری جوائننگ رپورٹ پر دستخط ثبت فرمائے اور مجھے کچھ بنیادی معلومات سے بہرہ ور کیا۔ ایک ناور و نایاب علیگ، پروفیسر سید اشرف علی شاہ مرحوم، پرنسپل تھے۔(۱) جاوید صاحب ان کے دستِ راست تھے۔ رحیم یار خاں میں میرے وارد ہوتے ہی، سب سے پہلے مجھے خوش آمدید کہنے والے پروفیسر رشید احمد انگوی تھے۔(۲) وہ میرے یونیورسٹی کے دور کی جولانیوں سے واقف تھے۔ بعد میں وہ میرے نظریاتی گُرو بھی بن گئے۔

میں اسے شہرت کہوں یا اپنی رسوائی کہوں
مجھ سے پہلے اس گلی میں میرے افسانے گئے

استادِ محترم ڈاکٹر انوار احمد(۳) نے مجھے غائبانہ طور پر جاوید صاحب کا مداح بنا دیا تھا۔ اب جب ان سے واسطہ پڑا تو جو کچھ سنا تھا، اس سے بڑھ کر پایا۔ جوں جوں ان سے قربت ہوئی، ان کی دل کش شخصیت کے نقوش لوحِ دل پہ مرتسم ہوتے چلے گئے۔

عبدالعزیز جاوید 4 جولائی 1925ء کو امام پور (عرف نکودر) ضلع شیخوپورہ میں پیدا ہوئے۔ شاہ پور، ضلع ننکانہ صاحب سے مڈل کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کا امتحان مسلم ہائی سکول طارق آباد، فیصل آباد سے مارچ 1942 میں پاس کیا۔ یہاں فارسی کا ذوق پروان چڑھانے میں استاد عبدالحق کامل نے اہم کردار ادا کیا۔ بعدازاں پنجاب ایگریکلچرل کالج و ریسرچ انسٹیٹیوٹ سے گریجوایشن مکمل کی۔ وہ لکھتے ہیں:

'' جہاں تک میرے ادبی ذوق کا تعلق ہے، مجھے سائنس سے کوئی رغبت نہ تھی۔ جب کہ زرعی کالج میں سائنس کی تعلیم اور وہ بھی انگریزی میں۔ چار سالوں میں جیسے تیسے بی ایس سی ایگری کلچر کر ڈالی، لیکن ادبی ذوق نے یہاں بھی پیچھا جاری رکھا۔''(۴)

ملازمت کا آغاز بہ طور ایگریکلچرل اسسٹنٹ، زرعی کالج لائل پور (موجودہ فیصل آباد) سے کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل فارسی اور ادیب فاضل اردو کے علاوہ ایم اے اردو 1952 میں اور ایم اے فارسی کا امتحان 1953 میں پاس کر لیا۔ اس زمانے میں سید عابد علی عابد اور ڈاکٹر سید عبداللہ ان کے محبوب اساتذہ تھے۔

ڈبل ایم اے ہونے کی بنا پر آپ کا تقرر گورنمنٹ کالج رحیم یار خاں (ریاست بہاول پور) میں بہ طور لیکچرار اردو، فارسی ہوا جہاں 9 دسمبر 1954 کو جوائن کیا۔ اسی کالج سے بہ طور پروفیسر، 60 برس کی عمر میں 3 جولائی 1985 کو ریٹائر ہوئے۔ 1985 تا 1988 اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں چیئر مین شعبہ فارسی کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

آغازِ شاعری:

محبت اور شاعری کا جوہر کم و بیش ہر شخص میں ہوتا ہے لیکن مناسب ماحول مل جائے تو اس کی نشو ونما ہوتی ہے۔ آغازِ شاعری کے حوالے سے عبدالعزیز جاوید لکھتے ہیں:

''(ڈاکٹر) سید عبداللہ ایک دن نہ جانے کس خیال میں تھے۔ کلاس میں داخل ہوتے ہی گویا ہوئے :''عزیزان آپ لوگوں میں سے کوئی شاعر بھی ہے؟'' ہم لوگوں کی طرف سے غایت ادب کی وجہ سے لانعم۔ پھر بولے:'' آپ نے کبھی عشق بھی کیا ہے؟'' پھر وہی سکوت دیکھ کر فرمایا:''عشق ہو گا تو شاعری بھی ہوگی''۔(۵)

اورینٹل کالج کی فضا میں جہاں علم وادب کی گہرائی اور گیرائی ہے وہاں جو جوان طلبا و طالبات کے لئے رومان پروری کا سامان بھی ہوتا ہے۔ کلاس اور کالج میں ہونے والے ادبی پروگراموں سے ان میں نکھار آتا ہے۔ عبدالعزیز جاوید میں خوش طبعی کا عنصر وافر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہماری ہم کلاس کچھ طالبات بھی تھیں۔ طلبا و طالبات کے درمیان انگریزی حرف ایل کے مشابہ پردہ حائل ہوتا تھا۔ یونین کے عہدوں کے امیدواروں میں ہمارے کچھ جماعتی بھی تھے۔ میرے چہرے پر اس وقت بھی ڈاڑھی تھی۔ استاد ابھی کمرے میں تشریف

نہیں لائے تھے۔ان امیدواروں نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے مجھے کہا کہ آپ ہماری حمایت کے لیے پردہ نشین طالبات کے پاس جایئے۔میں نے یہ کہتے ہوئے معذرت کی کہ صاحب، آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے کہ مولوی کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ مجھے خطرے میں نہ دھکیلیے''(۶)

عبدالعزیز جاوید کی شاعری زیادہ تر نظمیہ شاعری ہے۔اوائلِ جوانی میں وہ ہر سال زرعی کالج (اب زرعی یونیورسٹی) فیصل آباد کے اولڈ بوائز کے سالانہ اجتماع کے حوالے سے ''جوابِ خیر مقدم'' کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھا کرتے تھے۔یہ 1945 سے 1954 کا زمانہ تھا۔بعدازاں، وقفے وقفے سے یہ سلسلہ جاری رہا۔اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کلامِ جاوید اپنی ایک شان رکھتا ہے۔اس حوالے سے ان کے سفرایران نے بھی فارسی گوئی کو دو آتشہ کر دیا۔فارسی کے حوالے سے اُن کا نکتۂ نظر ہے:

''میرا گمان ہے کہ اردو فارسی ہی کا بانکا فرزند ہے۔جس زبان میں ساٹھ ستر فی صد الفاظ فارسی کے ہوں، اُس کا جدِ امجد اور کون ہو سکتا ہے؟ پھر صرف کثرتِ لغات ہی نہیں، قواعد میں صیغے وغیرہ بھی اسی سے مستفیض ہیں۔عمر میں بھی فارسی کو فوقیت حاصل ہے۔کہتے ہیں کہ اللہ بھی بزرگی کا لحاظ فرمائے گا۔تو اس سنت کی پیروی بندے کیوں نہ کریں؟''(۷)

وادیٔ تحقیق میں:

عبدالعزیز جاوید کو سرمایۂ تحقیق وافر ملا ہے لیکن عجیب بات ہے کی کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم وتدریس کے دوران میں اُن کا یہ کمال کم ظاہر ہوا۔ریٹائرمنٹ کے بعد تو گویا مضامینِ تازہ کا انبار لگا دیا ہے۔اب اس خرمن سے خوشہ چینی کرنے والوں کی تعداد روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے۔

کیمیائے سعادت کا اُردو ترجمہ:

حجۃ الاسلام امام ابوحامد محمد بن محمد بن محمد غزالی کی مشہورِ زمانہ تصنیف " کیمیائے سعادت " پانچویں صدی کے آخر میں لکھی گئی مگر نو صدیاں گزرنے کے باوجود بھی اس کی تابانی قائم ہے۔اس کا تازہ ترین اور صحیح ترین ترجمہ کرنے کا اعزاز پروفیسر عبدالعزیز جاوید کو حاصل ہوا ہے۔اس ترجمے کے پیچھے اُن کی برس ہا برس کی محنت کارفرما ہے۔ریٹائرمنٹ اور گھریلو آزمائشوں سے کچھ فرصت ملی تو آپ اپنے منجھلے بیٹے شاہد عزیز سے ملنے کینیڈا تشریف لے گئے۔وہاں کے ماحول نے آپ کو مہمیز کیا اور یوں علمی دنیا کو ایک شاہکار مل گیا۔انہوں نے انتساب میں لکھا ہے:

''متداول اُردو ترجموں میں محیر العقول بوالعجبیوں کے نام، جنہوں نے مجھے امام غزالی کی کیمیائے سعادت کے اصل فارسی متن کی راہ سجھائی۔''(۸)

کیمیائے سعادت جو امام غزالی کی مشہورِ زمانہ کتاب ''احیاء العلوم'' کا خلاصہ ہے، کے مختلف تراجم ہو چکے ہیں۔ان میں سے ایک اہم متداول ترجمہ مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع کے ادارے ''دارالاشاعت'' کا مطبوعہ ہے۔اس کے مترجم فخرالدین صدیقی ہیں۔اس میں موجود فاش غلطیوں کو دیکھ کر جاوید صاحب کو امام غزالی کے اصل متن کو دیکھنے کی جستجو پیدا ہوئی۔ مذکورہ فارسی نسخہ ایک ایرانی محقق حسین خدیو جم کا عربی سے ترجمہ شدہ ہے۔بہ قولِ جاوید:

''اب بھی عجیب قسم کی اغلاط اکسیرِ ہدایت میں موجود ہیں جو امام غزالی کا ہرگز منشا نہیں تھا''(۹)

اس کے بعد عبدالعزیز جاوید نے کئی اغلاط کی نشاندہی کی ہے۔مثلاً، امام ایک جگہ لکھتے ہیں کہ انسان کی اصل ضرورت صرف تین چیزیں ہیں یعنی روٹی، کپڑا اور مسکن۔پھر فرماتے ہیں کہ ان کے لئے بھی تین ہی حرفتوں کی ضرورت ہے۔وہ ہیں برزیگری وبنائی وجولاہی۔لیکن صدیقی صاحب نے برزیگری کا ترجمہ زرگری کیا ہے۔بھلا زرگر یا سنار کو روٹی کی فراہمی سے کیا تعلق برزیگری تو زراعت کو کہتے ہیں۔یہ کسان ہے جو گندم و جو کاشت اور برداشت کرتا ہے۔

اسی طرح ایک جگہ صدیقی صاحب نے فارسی عبارت کا ترجمہ کچھ یوں کیا ہے۔:

''اگر کسی عالم کو اس بات کی آگاہی حاصل ہو تو اس کو نہایت عزیز جاننا چاہیے۔اس کی زیارت بھی عبادت ہے۔اس کے واسطے سب کو چھور دینا چاہیے۔اصل فارسی متن یہ ہے''پس اگر با کسی آگاہیء این معنی بود، سخت عزیز تر بود و دیدار وی عبادت بود ہمہ را بادی تبرک باید کرد' اس کا صحیح ترجمہ یہ بنتا ہے۔''پس اگر کوئی اس حقیقت سے آگاہ ہو تو ایسا شخص بہت نادر ہوتا ہے۔ایسے شخص کی زیارت عبادت ہوگی۔اس سے سبھی کو برکت حاصل کرنی چاہیے''یعنی مرجم نے "تبرک" کو "ترک" سمجھا۔اس سے اجتماعِ نقیضین کا عیب پیدا ہوتا ہے۔''(۱۰)

یہ جاوید صاحب کی علم دوستی کا بین ثبوت ہے کے انہوں نے 961 صفحات پر مشتمل بڑی تقطیع کی یہ ضخیم کتاب اپنی گرہ سے شایع کروائی ہے اور یہ گنج گراں مایہ احباب کی ضیافتِ طبع کے لیے مفت نذر کیا ہے۔

کیمیائے سعادت کے فارسی مترجم، حسین خدیو جم کا مقدمہ خاصے کی چیز ہے اور اس کے اردو مترجم و تصحیح نگار عبدالعزیز جاوید نے ترجمے کا حق ادا کر دیا ہے۔آج سے کم وبیش ایک ہزار سال قبل اس عبقری

کے بارے بہت سی نئی باتوں کی جان کاری ہوتی ہے۔مثلاً:

''جب غزالی سے پوچھا جاتا ہے کہ تم ابوحنیفہ کا مذہب رکھتے ہو یا شافعی کا؟ آپ جواب میں کہتے ہیں "میں عقلیات میں مذہب برہان رکھتا ہوں، شرعیات میں قرآن کا مذہب۔ابو حنیفہ یا شافعی، دونوں سے میں نے کچھ نہیں لیا۔''(۱۱)

فارسی متن سے اردو ترجمہ میں ہمیں نئے نئے گوہر آبدار ملتے ہیں، ایک اقتباس دیکھیے:

''غزالی دیکارت کی طرح یوں نہیں کہتا کہ ''میں سوچتا ہوں، پس میں ہوں'' بلکہ وہ وہی کہتا ہے جو اس سے پہلے اور بعد کے صوفیا نے کہا ''میں روحانی تجربے میں مصروف ہوتا ہوں، میں معرفت کو چکھتا ہوں، میں چاہتا ہوں، پس میں ہوں اور وہ خدا جو وجدو اقبال اتصال کے عالم میں مجھ پر آشکار ہوتا ،موجود ہے۔''(۱۲)

واضح رہے کہ غزالی نے یہ بات دیکارت سے ساڑھے پانچ سو سال پہلے کہی ہے۔اسی طرح فارسی متن کے کچھ اور متاثر کن اقتباسات کا ترجمۂ جاوید دیکھیے:

1۔''غزالی ہی وہ عبقری ہے جس نے کندی، فارابی اور ابن سینا کے ساختہ و پرداختہ مسائلِ الٰہیات کے باب میں فلسفہ مشائی اسلام پر کاری ضرب لگائی۔ بلاشبہ اس فلسفے نے غزالی کی کتاب تہافت الفلاسفہ کے شیوع کے بعد اپنے استقلال کو رفتہ رفتہ کھو دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہا کہ ابنِ رشد اور خواجہ نصیر طوسی جیسوں کا دفاع بھی کارگر نہ ہو سکا۔''(۱۳)

2۔''جس طرح غزالی کے روحانی انقلاب کو ہم ایک نئے جنم کا نام دے سکتے ہیں اور اس کی بے قرار جان کے لئے ایک جدید رستاخیز قرار دے سکتے ہیں۔اس طرح اس انقلابی حرکت کو جو آپ نے اپنے زمانے میں علومِ دینی اور اسلامی زندگی کو بخشی، زندگی ساز تحریک کا نام دے سکتے ہیں۔''(۱۴)

3۔''تحقیق و کنجکاوی سے عشق میری فطرت کا خمیر تھا۔ادراکِ حقائق کی پیاس نوجوانی ہی سے میری رفیقِ راہ تھی۔مجھ میں ایک مدت سے ہر چیز کی حقیقت دریافت کرنے کی تشنگی تھی۔یہ تشنگی میرے اختیار میں نہ تھی بل کہ فطری اور جبلی تھی۔میری روح تقلید سے چین نہ پاتی تھی۔کسی کے قول کو بغیر دلیل و برہان کے کافی نہ جانتا تھا۔''(۱۵)

شادمان و جنت نشان رہے روحِ غزالی کہ جس نے خداشناسی، خودشناسی، دنیاشناسی اور آخرت شناسی کے سمندر کو ''احیاء العلوم'' اور ''کیمیائے سعادت'' کی شکل میں بند کر کے ہمارے حوالے کر دیا۔رحمت خداوندی ہو، ڈاکٹر حسین خدیوجم پر جنہوں نے اسے جدید زمانے سے ہم آہنگ کیا۔سلام ہو پروفیسر عبدالعزیز جاوید پر جنہوں نے اسی رودِرواں کو متلاشیانِ حقیقت کے لئے تحفہ خاص بنا دیا ہے۔

کشف المحجوب:

ابوالحسن علی بن عثمان جلابی ہجویری غزنوی المعروف حضرت داتا گنج بخش، آسمان معرفت کا ایک گروب نا آشنا روشن ستارہ ہیں۔ان کی تصنیف "کشف المحجوب" کی کرنیں کم و بیش نو سو برس سے متلاشیانِ حق کے قلب و نظر کو منور کر رہی ہیں۔ایرانی نژاد محقق ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی رہانے بیس برس کی محنت شاقہ سے اس کا فارسی متن اور حواشی و تعلیقات مرتب کئے ہیں اور اسے داتا صاحب کے عظیم کمپلیکس کے افتتاح کے موقع پر ۱۹۹۹ء میں شائع کیا۔

معروف ماہر اقبالیات اور پنجاب یونیورسٹی اقبال چیئر کے صدر نشین پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم اکرام نے پروفیسر عبدالعزیز جاوید کی توجہ اس کتاب کے اردو ترجمے کی جانب مبذول کرائی۔کتاب کے مؤلف ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی رہا نے ایک خط کے ذریعے بہ خوشی اس کے اُردو ترجمے کی اجازت دی۔اس اردو ترجمے کے خاص بات یہ ہے کہ یہ ''تحلیل کشف المحجوب'' کا واحد، تازہ اور صحیح ترین ترجمہ ہے۔اس ترجمے سے کشف المحجوب کے مستند متن اور پیغام کو اردو داں طبقے تک پہنچانے میں مدد ملے گی۔مؤلف نے ایک فارسی نظم میں مترجم کا دلی شکریہ بھی ادا کیا ہے۔

تو اے عبدالعزیز جاویدانی
بہ گلزارِ وفا گوہر فشانی

مترجم نے بھی مؤلف کا "ترکی بہ ترکی" ایک فارسی نظم میں اور اُسی بحر میں، جواب آں تشکر پیش کیا اور خوب کیا:

بحمداللہ اجازہ شد کہ اردو
بہ کار آرم بہ ابلاغِ معانی(۱۶)

''ترجمہ تحلیل کشف المحجوب'' کے حوالے سے ایک تحقیقی مقالہ لکھنے والے سکالر غلام یٰسین کا کہنا ہے:

''پروفیسر عبدالعزیز جاوید نے ڈکٹر محمد حسین تسبیحی رہا کی تالیف ''تحلیل کشف المحجوب'' کا ترجمہ اردو زبان میں کیا ہے جس میں اصل متن کے مزاج، واقعات کے تسلسل اور زبان و بیان کو اردو زبان میں بھی برقرار رکھنے کی کوشش واضح طور پر نظر آتی ہے''۔(۱۷)

صاحب کشف المحجوب نے اظہار مدعا کے لئے تماثیل کا سہارا بھی لیا ہے۔اس کا عکس ''تحلیل کشف المحجوب'' میں بھی ہے اور اسی طرح اس کے ترجمہ میں بھی کشف المحجوب کی اثر آفرینی کی خوشبو قاری کے مشامِ جاں کو معطر کرتی ہے۔

ڈاکٹر تسبیحی کے بہ قول، کشف المحجوب میں عربی الفاظ کی بہتات ہے۔اس پر عبدالعزیز جاوید اپنی رائے یوں ظاہر کرتے ہیں:

''اقوامِ مشرق علمی اعتبار سے، ایک مدت ہوئی بانجھ ہو چکی ہیں۔خود فارسی زبان جو ایک طویل عہد تک علمی نابغوں کے کارناموں کی بنا پر نہایت متمول تھی، بے جا تعصب کی بنا پر اس سرزمین سے جس نے بے تعصبی کے عہد میں سیکڑوں عبقری علمی میدان اور دینی مدارس کو فراہم کئے تھے، تعصب کی بنا پر عقیم ہو چکی ہے۔حافظ کے صدیوں بعد لے دے کے ایک جامی پیدا ہوئے۔پھر کئی صدیوں بعد فارسی زبان کے مستند شاعر اقبال پیدا ہوئے۔ایران میں نہیں، ہندوستان میں وجود پذیر ہوئے۔ایرانیوں کا تعصب عربوں کے خلاف ناقابلِ فہم ہے جن بزرگ کی بلند نظری نے اہلِ فارس کو اسلام سے بہرہ ور کیا، اسی کے دشمن ہیں۔فارسی سے عربی الفاظ چن چن کر خارج کر رہے ہیں۔یہ وہی الفاظ ہیں جنہوں نے افکارِ حافظ و سعدی کو عالمی سطح پر عظمت و فضیلت سے بہرہ مند کیا۔''(۱۸)

جاوید صاحب نے جناب ڈاکٹر تسبیحی کی تکرار تفاصیل پر جہاں علمی و فکری محاکمہ کیا ہے وہاں ان کی محنت اور اخلاص کی بجا طور پر تعریف بھی کی ہے۔مثلاً تسبیحی صاحب نے سید ہجویر کے زمانے کی زبان اور الفاظ و تراکیب کی جو گرہ کشائی کی ہے، قابلِ تعریف ہے۔اس ترجمہ میں سادہ اور عام فہم اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو کہ مترجم کی اپنی شخصیت کا خاصہ بھی ہے۔ مطالب کی بہتر تفہیم کے لئے تاریخی واقعات کے ضمن میں سنہ ہجری کے ساتھ سنہ عیسوی کا تطابق بھی رکھا گیا ہے اور اس سلسلے میں ضروری حزم و احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔تحریر کی متانت اور اسلوب کی سادگی نے اس ترجمہ کو ایک وقار عطا کیا ہے۔جناب جاوید ترجمہ کی اثر آوری کے لئے سید ہجویر کے خطابیہ آہنگ سے بھی استفادہ کیا ہے۔یوں گویا ''کشف المحجوب'' کا نورِ معانی اور لفظی برکات " تحلیل کشف المحجوب" کے راستے " ترجمہ تحلیل کشف المحجوب" میں بھی ضوریز ہیں۔

دبیرِ عجم:

استاذ الاساتذہ مولانا اصغر علی روحی، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کے مایہ ناز استاد اور محقق تھے۔انہوں نے کم و بیش 42 برس تک اپنے علم و اخلاص سے طالب علموں کے اذہان و قلوب کو منور کیا۔جناب عبدالعزیز جاوید کو بھی اُن سے شرفِ تلمذ حاصل رہا۔علم معانی اور بیان و بدیع کے حوالے سے پروفیسر روحی کی نہایت محققانہ فارسی تالیف " دبیرِ عجم" کا اردو ترجمہ کرنے کی سعادت جاوید صاحب کو ملی۔اس ترجمے کا معنی خیز انتساب دیکھیے:

''زبان کے دقائق اور شعر کے حسن و قبح سے کم آشنا کثرتِ کثیرہ کے نام''۔(۱۹)

شروع میں میں جناب اصغر علی روحی کے احوال و آثار اور فکری و فنی خدمات پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔مترجم لکھتے ہیں:

'' کالج میں پروفیسر ہونے کے علاوہ مولانا روحی ایک مذہبی رہنما، خطیب اور مفتی بھی تھے۔مقرر بھی اور صاحبِ تصنیفات بھی۔صحافی بھی تھے اور شاعر بھی۔صاحبِ حال بھی تھے اور صاحبِ قال بھی۔اس لئے ان کا دائرۂ احباب بہت وسیع تھا۔ان میں سر محمد شفیع، سر شیخ عبدالقادر، سر میاں فضل حسین، میاں شہاب الدین، علامہ اقبال۔یہ سب اکابرین مولانا روحی کا حد درجہ احترام کرتے تھے، مولانا ظفر علی خان بھی اکثر آپ سے ملنے کو آیا کرتے تھے۔علامہ اقبال تو ان کی بصیرتِ علمی کے حد درجہ مداح تھے۔فرماتے ہیں" محاورہ تو پڑھا ہے کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے مگر جب سے مولانا روحی سے ملاقات ہوئی ہے حقیقتاً معلوم ہوا کہ اس شخص میں علم کا دریا بند ہے''(۲۰)

مولانا روحی کا اسلوبِ بیان مفسرانہ اور معربانہ تھا۔عامی قاری یا سامع کی رسائی ان کے مفاہیم تک مشکل تھی، اسی لئے جناب جاوید نے ان کی تالیف ''دبیرِ عجم'' کا ترجمہ کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔مولانا روحی نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود تصنیف و تالیف کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔قرآن کے انتیسویں اور تیسویں پارے کی تفسیر، علم الکلام پر مبنی دو جلدیں ''مافی الاسلام''، علم تصوف کی کتابیں ''الآیۃ الکبریٰ فی شرح اسماء الحسنیٰ'' اور ''اسرار التنزیل''، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حوالے سے ''امیر الکلام من کلام الامام''۔اس کے علاوہ رسالہ ''الہدیٰ'' دس برس تک شائع ہوتا رہا۔

تذکرۂ خوش نویساں:

مولانا غلام محمد ہفت قلمی دہلوی کی نادر تصنیف ''تذکرہ خوش نویساں'' کو محمد ہدایت حسن مدرس زبان عربی و فارسی پریذیڈنسی کالج کلکتہ نے 1910ء میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے لئے شائع کرایا۔پروفیسر عبدالعزیز جاوید نے اس تصنیف لطیف کا اردو ترجمہ کیا ہے۔مترجم نے اس نادر و نایاب کتاب کو اپنی گرہ سے چھپوا کر افادہ عام کے لئے ۱۹۱۴ء میں تقسیم کیا، یوں قیمت اس کی ۵۰۰ روپے رکھی گئی مگر زیادہ مفت تردی گئی۔''پیش گفتار'' کے عنوان سے مترجم لکھتے ہیں:

''خطاطی کے گوناگوں پیرائے اس امر کے غماز ہیں کہ ملتِ اسلامیہ فطرتاً حسن شناس ہے۔لیکن یہ جو

انہوں نے عصر حاضر میں فکر ونظر کا مرکز دل کی بجائے شکم کو قرار دے لیا ہے، کم بینی وکج بینی کی دین ہے۔حسن شناسی کے لئے صاحب دل ہونا لازم ہے۔''(۲۱)

مترجم افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ ترکی میں عربی رسم الخط کو رومن بنانے سے ملتِ اسلامیہ کا بے پناہ نقصان ہوا۔ برصغیر میں بھی اگر سرسید احمد خاں استقامت کے ساتھ اردو کے شانہ بہ شانہ کھڑے نہ ہوتے تو آج ہم بھی اپنے علمی ورثے سے محروم ہو چکے ہوتے۔ترتیب کے مطابق، یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔عربی رسم الخط اور فارسی رسم الخط کی تاریخ اور فن خوش نویسی کی تاریخ کا اجمالی جائزہ لینے اور پائیدار روشنائی بنانے اور مختلف خطوں کی اقسام درج کرنے کے علاوہ آخر میں نسخ اور نستعلیق خطاطی کے نادر ونایاب نمونے بھی دیے گئے ہیں۔

ہفوات:

پروفیسر خواجہ حمید یزدانی نے ''گلستانِ سعدیؒ (فارسی) کا ترجمہ کیا جسے سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور نے شائع کیا۔اس میں بے شمار غلطیاں موجود ہیں جس کی تصحیح پروفیسر عبدالعزیز جاوید نے کی۔ اس تصحیح کا سنِ اشاعت نہیں دیا گیا۔اس میں پچاسی ایک اغلاط کی نشان دہی کر کے ان کی تصحیح کی گئی ہے۔قریب پانچ صفحات پر مشتمل ''سیرے در شرح گلستانِ سعدی از کلک پرفسور خواجہ حمید یزدانی'' شاملِ تالیف ہے۔مترجم کو اس ترجمے پر سابق وزیرِ اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف صاحب کی جانب سے طلبہ کو انعامات کے طور پر نوازا جس پر پروفیسر صاحب نے افسوس کا اظہار کیا ہے کیوں کہ وہ ترجمہ اغلاط سے پُر ہے:

''گلستانِ سعدیؒ (فارسی) کا جو اردو ترجمہ پروفیسر خواجہ حمید یزدانی پی ایچ ڈی نے کیا ہے اسے سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا ہے اور جسے سابق وزیرِ اعلیٰ پنجاب شہباز شریف صاحب نے کالجوں کے مقرر طلبا وطالبات کو بہ نفسِ نفیس نقد انعامات کے ساتھ عطا کیا ہے، وہ پچاسی ایک اغلاط سے پُر ہے، وہ اغلاط اور ان کا صحیح ترجمہ آئندہ اوراق میں ملاحظہ فرمائیں۔''(۲۲)

نمونے کے طور پر ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

۱۔متن گلستان:

مکن فراخ روی در عمل اگر خواہی
کہ وقت رفع تو باشد مجال دشمن تنگ

ترجمہ خواجہ:''اگر تو چاہتا ہے کہ تیری معزولی کے وقت تیرا دشمن عاجز ہو کر رہ جائے۔''

صحیح ترجمہ: اگر تو چاہتا ہے کہ تیری ترقی کے موقع پر دشمن کو اعتراض کی مجال نہ ہو تو دیوانی اور مالی امور میں بے احتیاطی نہ کر اور اپنے اختیارات سے بڑھ کر پاؤں نہ پھیلا۔(۲۳)

۲۔متن گلستان

سہمگین آبی کہ مرغابی دارد ایمن نبودی
کمترین موج آسیا سنگ از کنارش در بودی

ترجمہ خواجہ: خوف ناک سیلاب جس میں کوئی مرغابی محفوظ نہ تھی، اس کی ہلکی سی لہر اس دریا کے کنارے چکی کے پتھر اڑا کے لے جا رہی تھی (استعارے میں ہنرور کی کوشش کی بات کی ہے)۔''

صحیح ترجمہ: ہراساں کرنے والا دریا کہ مرغابی بھی اس میں آسایش نہ رکھتی تھی اس کی چھوٹی سے چھوٹی موج چکی کے بھاری پتھر کو باہمہ ضخامت ساحل سے کھینچ کر (اپنے ساتھ پانی کے بہاؤ میں لے جائے)۔''(۲۴)

۳۔متن گلستان:''خشم بیش از حد گرفتن وحشت آورد لطف بی وقت ہیبت ببرد۔''

ترجمہ خواجہ:''حد سے زیادہ غصہ اختیار کرنا وحشت لاتا ہے اور بے وقت کی مہربانی خوف دور کر دیتی ہے۔''

صحیح ترجمہ: حد سے زیادہ غصہ اختیار کرنا وحشت کا باعث ہوتا ہے اور بے جا مہربانی ہیبت کو دور کر دیتی ہے۔(۲۵)

یہ پروفیسر صاحب کی باریک بینی اور ژرف نگاہی ہے جس نے ان اغلاط کی نشان دہی کر کے تصحیح بھی کر دی۔

پروفیسر عبدالعزیز جاوید شہرت سے بت نیاز ایک ایسا عبقری ہے جس محولہ بالا نوادرات کے علاوہ حال ہی میں (۲۰۱۹ء) اپنی جسمانی کمزوری اور ۹۲، ۹۳ برس کی عمر میں اہلِ علم کو ایک اور یادگار تحفہ پیش کیا ہے۔یہ ہے شیخ سعدیؒ کی مشہورِ زمانہ تصنیف ''گلستانِ سعدی'' کا اغلاط سے پاک اُردو ترجمہ۔اس کا انتساب دیکھئے

''گلستانِ سعدی (فارسی) کے غلط اردو مترادم کے نام جنہوں نے مجھے صحیح ترجمہ کرنے پر اکسایا''(۲۶)

آخر میں مجھے اپنی کم ہمتی کا اعتراف کرنا ہے کہ میں اس مختصر مضمون میں عبدالعزیز جاوید کی شخصیت اور سب کارہائے نمایاں کا مکمل احاطہ نہیں کر پایا۔یہ ایک کتاب کا موضوع ہے، چند صفحات میں سما نہیں سکتا۔یار زندہ صحبت باقی۔۔۔۔۔۔افسوس کہ اس مضمون کی اشاعت سے پہلے آسمانِ علم وادب کا یہ درخشندہ ستارہ ۲۱ فروری ۲۰۲۰ء بروز جمعۃ المبارک ۹۵ برس میں غروب ہو گیا۔

ڈاکٹر عاصم ثقلین کا بھارتی اُردو فلمی شاعری پر پی ایچ ڈی کا پُرمغز مقالہ

نذیر خالد

یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ایم۔فل اور پی ایچ ڈی کے جو مقالات لکھوائے جاتے ہیں وہ علم وادب سے یا مختلف علمی شاخوں سے گہری دلچسپی رکھنے والوں کے لیے تو یقیناً باعثِ کشش ہو سکتے ہیں لیکن ایسے مقالات بہت کم دیکھے گئے ہیں جن میں عام شہریوں کے لیے بھی کشش ہو اور وہ ان تک رسائی پانے اور استفادہ کرنے کی کوشش کریں۔اس نوعیت اور خوبیوں کے حامل دو مقالہ جات صادق ایجرٹن کالج، بہاولپور میں اردو ادب کے استاد جناب ڈاکٹر عاصم شجاع ثقلین نے اپنے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے لکھے جن میں انہیں یقیناً تحقیق کے مشکل ترین مرحلوں سے گزرنا پڑا کیونکہ ان مقالہ جات کے لیے مطلوب مواد اور ڈیٹا کہیں سے یکجا دستیاب نہ تھا اور پھر ان موضوعات منفرد ہونے کی بنا پر اضافی معلومات و رہنمائی بھی مفقود تھی۔

قارئین کرام ان موضوعات سے خود بھی اندازہ کر سکیں گے کہ یہ کام آسان ہرگز نہ تھا۔عاصم صاحب کے ایم فل کا موضوع ''بھارتی فلمی اردو شاعری میں صنائع و بدائع'' تھا۔یعنی بھارتی فلمی گیتوں میں موجود وہ لفظی و معنوی خوبیاں جو شاعری کو شاندار بنانے کا سبب ہوتی ہیں۔یہ صنائع تعداد میں ایک سو سے بھی زیادہ ہیں۔ڈاکٹر عاصم ثقلین کا یہ مقالہ کتابی شکل میں ''ارتباطِ حرف و معنی'' کے نام سے چھپ چکا ہے۔اس کتاب کا انتساب بھی بھارتی فلمی شاعری کے دو اہم ترین شخصیات گلزار اور جاوید اختر کے نام ہے۔اپنے اسی کام کو مزید آگے بڑھاتے اور تکمیل تک لے جاتے ہوئے ڈاکٹر عاصم نے پی ایچ۔ڈی کے لیے ''بھارتی فلمی اردو شاعری کا موضوعاتی و فنی جائزہ (ابتدا سے 2000ء تک)'' کا موضوع منتخب کیا۔

یوں تو اس آخرالذکر موضوع میں دلچسپی کی صد ہزار باتیں ہیں جن کو پڑھ کر یا جان کر ہر فرد لطف اندوز ہو سکتا ہے لیکن اس کا یہ ایک پہلو بطور خاص توجہ کھینچتا ہے کہ کیا بھارتی فلمی گیتوں کی اردو شاعری معیار ایسا رہا ہے کہ اس پر تنقید و تحقیق کی جا سکے، اور کیا فلمی گیت نگاری عام شاعری کی نسبت آسان ہے یا مشکل؟ اس سوال کے جواب میں عاصم صاحب کا موقف یہ رہا ہے کہ عام شاعری کے برعکس فلم کے لیے اچھا گیت لکھنا کئی وجوہات کی بنا پر مشکل بھی ٹھہرتا ہے۔عام شاعری میں، چاہے وہ نظم ہو، غزل یا کوئی اور صنف ،شاعر کے لئے میدان کھلا ہوتا ہے اور وہ اپنی من مرضی کی شاعری کرتا ہے اور سوائے شاعری کے مروجہ قیود و ضوابط کے اس پر کوئی بیرونی بندش لاگو نہیں ہوتی جبکہ فلمی گیت میں شاعر کی اپنی مرضی ختم اور اسے کسی دوسرے کی مرضی کے مطابق کلام کرنا ہوتا ہے، فلمی شاعر کو سخن گوئی کی تمام شرائط کی پاسداری کے ساتھ کئی ضروریات کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ یہ وہ گیت کس مقصد اور سچوایشن کے لیے لکھا جا رہا ہے ،اسی طرح متعلقہ کردار جس پر گانا پکچرائز ہوگا، اس کا سٹیٹس، تعلیمی قابلیت اور زبان کا لہجہ وغیرہ سب باتیں سامنے رکھنا پڑتی ہیں تاکہ خیالات، الفاظ اور زبان و بیان کردار کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں۔اس کے ساتھ ساتھ اگر گیت کی طرز پہلے سے طے ہے تو شاعر کو اس طرز اور میٹر پر بھی پورا اترنا ہوتا ہے۔اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ گیت کی زبان کو عام فلم بین کی ذہنی سطح سے بلند بھی نہیں رکھا جا سکتا۔

فلمی شاعری پیچ در پیچ والا معاملہ ہے کیونکہ وہ تمام شرائط تو یہاں بھی سختی کے ساتھ عائد ہیں جو غیر فلمی شاعری پر ہیں لیکن ان سے ماورئ جن پابندیوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے وہ ہرگز معمولی نہیں بلکہ یہ سب کسی سخنور کی علمی، فنی اور شاعرانہ صلاحیتوں کے بہت کڑے امتحان کے مترادف ہے۔جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا گیا کہ فلمی کردار، سچوایشن، موضوع کو مدنظر رکھنے کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کو پسند آنے کی غیر معمولی کڑی شرط بھی موجود ہے کیونکہ یہ کمرشل کام ہے جس میں کوئی گیت بھی فلمی شہرت و پسندیدگی اور کامیابی کا باعث بن سکتا ہے۔ڈاکٹر عاصم کے بقول ان تمام لوازمات و شرائط کو اگر ذہن میں رکھیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک فلمی شاعر کے لیے ایک صاف، اچھا اور دل میں اترتا گیت لکھ لینا یقیناً ایک بہت مشکل کام ہوتا ہے اور اسی بنا پر فلمی پروڈیوسرز ہمیشہ قادرالکلام شعراء سے فلمی گیت لکھوایا کرتے تھے۔۔انہوں نے اس حوالہ سے ایک پُرلطف مثال بھی پیش کی جو گیت نگاری کے مشکل کام کو سمجھنے میں مدد گار ہو سکتی ہے۔سنہ 1995ء کی معروف فلم ''دل والے دلہنیا لے جائیں گے'' کے لیے لکھے گئے معروف فلمی شاعر آنند بخشی کے اس گیت میں بیک وقت تین مختلف بحروں کا استعمال کیا گیا ہے۔گیت کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

تجھے دیکھا تو یہ جانا صنم
پیار ہوتا ہے دیوانہ صنم

آنکھیں مری سپنے ترے، دل میرا یادیں تیری
میرا ہے کیا، سب کچھ ترا، جاں تیری سانسیں تیری
میری آنکھوں میں آنسو ترے آ گئے
مسکرانے لگے سارے غم

پہلے دو مصرعوں میں ایک، تیسرے اور چوتھے مصرعے میں دوسری اور پانچویں مصرعے میں تیسری بحر استعمال کی گئی ہے۔اس گیت کا ہر بند اسی طرح تین بحور میں لکھا گیا ہے۔

عاصم صاحب سے سوال کیا گیا کہ آپ کو ایسے مشکل موضوع پر کام کرنے کا کیسے سوجھا؟ خاص کر اس صورت حال میں کہ اس تھیسس کے لئے مطلوبہ مواد یعنی فلمی گیتوں کا مکمل ریکارڈ جو کہیں تحریری صورت میں موجود نہیں ہے اسے حاصل کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔انہوں نے جواب دیا کہ یہ موضوع ان کے استادِ محترم اور اس مقالہ کے نگران ڈاکٹر شفیق احمد صاحب کا تجویز کردہ تھا۔ڈاکٹر عاصم تقلین کے ایم فل کے مقالے کا موضوع، بھارتی فلمی اردو شاعری میں صنائع و بدائع تھا جسے انہوں نے پی ایچ۔ڈی کے مقالہ میں وسعت دی۔انہوں نے 2010ء میں پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا اور 2016ء میں یہ مقالہ مکمل کر کے جمع کروایا۔

اس سوال کے جواب میں کہ ریسرچ کے مطابق انڈیا کی پہلی اردو فلم کون سی تھی، ڈاکٹر عاصم صاحب کا کہنا تھا کہ پہلی فلم عالم آرا تھی جو 14 مارچ 1931ء کو ممبئی کے میجسٹک سینما میں نمائش کے لئے پیش کی گئی۔جوزف ڈیوڈ مذکورہ فلم کے رائٹر اور پروڈیوسر تھے۔اس زمانہ میں فلموں کا انداز کلاسیکل ڈرامے کا سا تھا۔اس ابتدائی زمانہ میں فلم کا کہانی کار ہی اس کے گیت بھی لکھتا تھا اس لیے اس فلم کے مصنف جوزف ڈیوڈ ہی بھارتی فلموں کے اولین گیت نگار ٹھہرتے ہیں۔ایک بات اور بھی اہم ہے کہ فلموں کے آغاز یعنی 1931ء سے لے کر تقریباً 1942ء تک کی فلموں اور اُن کے گیتوں کا کہیں کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے تاہم فلم عالم آرا بعد میں بھی دو دفعہ 1950ء اور 1970ء کی دہائی میں بھی فلمائی گئی۔

فاضل مقالہ نگار نے انیس سو چالیس کی دہائی کے چند نغمات حوالے کے طور پر اپنے مقالہ میں شامل کئے ہیں جسے انہوں نے ٹوٹی پھوٹی شاعری قرار دیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ یہ شاید اس وجہ سے ہے کہ اس پر پوری توجہ نہیں دی گئی اور شاید اس زمانہ کی فلموں میں مرکزی نقطہ کوئی اور رہا ہوگا۔ڈاکٹر عاصم اس مقالہ میں فلمی گیتوں کی موضوعات کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے جس کے مطابق گیت المیہ، طربیہ، مذہبی، تہذیبی و ثقافتی اور قومی و ملی ہو سکتا ہے۔اسی ریسرچ کی بنیاد پر اپنا یہ تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے کہ سنہ انیس سو ساٹھ سے انیس سو اسی کے زمانہ کو بھارتی اردو فلمی شاعری کا سنہرا دور قرار دیا جا سکتا ہے۔اس دوران میں بہت عمدہ بلکہ چوٹی کے شاعر سامنے آئے جنہوں نے شاعری کی ہر ہیئت کو فلمی نغموں کے لئے کامیابی سے استعمال کر کے دکھایا جن میں، مثلث، مربع اور مخمس وغیرہ بھی شامل تھیں۔مقالے میں بیس اہم ترین بھارتی فلمی شعراء کے حالاتِ زندگی اور اُن کے کلام کی نمایاں خصوصیات بھی مذکور ہیں۔

تجزیے میں مزید بتایا گیا ہے کہ سن انیس سو اسی کے بعد بھارتی فلمی دنیا میں ایک زبردست تبدیلی دیکھنے میں آئی۔1982ء میں بننے والی فلم ''ڈسکو ڈانسر'' کے بعد انڈین فلم انڈسٹری رقص اور موسیقی کے ایک ناڈرن دور میں داخل ہو گئی جو درحقیقت انڈیا فلم انڈسٹری کی اردو شاعری کے زوال کا آغاز بھی تھا۔فن کی جگہ عریانی اور گلیمر نے لے لی اور گیت نگاری کہیں پیچھے رہ گئی۔

مقالہ نگار کا کہنا ہے کہ کوئی بھی گیت کا انحصار تین بنیادی عناصر پر ہوتا ہے۔1۔گلوکار کی آواز 2۔شاعری 3۔ نغمے کی دھن اور موسیقی ۔۔۔۔۔۔ان تین عناصر میں سے اگر کوئی سے بھی دو عناصر یک جا ہو جائیں تو ایک اچھا نغمہ تخلیق پاتا ہے لیکن اگر کسی گیت میں یہ تینوں خوبیاں موجود ہوں تو نغمے کو کمال حاصل ہو جاتا ہے اور ایسے گیت ہی لمبی عمر پاتے ہیں۔یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ گیت جن کی شاعری یا الفاظ اچھے نہ ہوں، وقتی طور پر پاپولر یا مشہور ہو جاتے ہیں لیکن طویل عرصہ تک اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتے۔یہی وجہ ہے کہ انیس سو نوے کے بعد کے گیت قلیل العمر ثابت ہو رہے ہیں۔

موجودہ دور کے بھارتی اردو فلموں کے شعراء متعدد ہلکے پھلکے، ثقافتی اور محبت سے بھرپور فلمی نغمے لکھ لیتے ہیں۔ایسے گیت وقتی طور پر تو سامعین کے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں مگر آگے چل کر دیکھیں تو ان کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر عاصم تقلین کے مقالے کا ایک اہم امر اور جس کا تذکرہ یہاں نہایت ضروری ہے یہ ہے کہ بھارتی اردو فلموں کو ہندوستان میں ہندی فیچر فلمیں کہا جاتا ہے اور ہندی فلم ہی کا سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے حالاں کہ وہ فلمیں اُردو ہوتی ہیں اور ان فلموں کے گیت بھی ہندی نہیں بلکہ مکمل طور پر اردو زبان کے گیت ہوتے ہیں۔غور کیا جائے تو خالص ہندی کے وہ الفاظ جو ان فلموں کے ڈائیلاگ میں جا بجا ملتے ہیں ، ان ''ہندی'' گیتوں میں کہیں بھی نظر نہیں

آ تے۔ڈاکٹر عاصم نے ایک مختصر سی فہرست مرتب کی ہے جس میں انہوں نے ایسے کچھ الفاظ بتائے ہیں جو ہمیں ان فلموں کے مکالموں میں بار بار سننے کو ملتے ہیں لیکن فلمی گیتوں میں کہیں موجود نہیں۔مثال کے طور پر اس فہرست میں سے کچھ الفاظ ملاحظہ کیجیے:

آدرش بہ معنی اصول؛ آروپ بہ معنی الزام؛ اپرادھ بہ معنی جرم؛ اَتیت بہ معنی ماضی؛ اِچھا بہ معنی خواہش ،تمنا؛ اَشُبھ بہ معنی نحس؛ اشیرباد بہ معنی دُعا؛ انت بہ معنی اختتام؛ انیائے بہ معنی ظلم؛ اَوَشے بہ معنی ضرور، یقیناً؛ بھاؤنا بہ معنی خواہش؛ بھومیکا بہ معنی کردار؛ پالن کرنا بہ معنی سنبھالنا،خیال رکھنا؛ پرنتو بہ معنی مگر؛ پُن بہ معنی نیکی؛ پوتر بہ معنی پاک؛ تُرنت بہ معنی فوراً؛ چرنوں میں بہ معنی قدموں میں؛ چنتا بہ معنی فکر؛ دھرم بہ معنی مذہب؛ سمبندھ بہ معنی تعلق؛ شبد بہ معنی لفظ؛ شراپ بہ معنی بد دعا؛ شما کرنا بہ معنی معاف کرنا؛ شوبھا بہ معنی زینت؛ کنڈلی بہ معنی زائچہ؛ لکشمی بہ معنی دولت؛ نیائے بہ معنی عدل؛ ویرتا بہ معنی بہادری؛ وجے بہ معنی فتح؛ یودھ بہ معنی لڑائی وغیرہ وغیرہ۔

یہ اور ان جیسے کئی الفاظ فلمی مکالمے میں تو عام ہیں لیکن پچھلے نوے برس کی فلمی شاعری میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ یہ امر اس بات کا واضح ثبوت ہے بھارتی فلمی شاعری خالص اردو شاعری ہے۔مقالہ نگار کا کہنا ہے کہ اگر کسی فلم کے گیتوں میں شعراء نے ہندی الفاظ کا استعمال کرنے کی کوشش یا تجربہ کیا بھی تو وہ فلم یا گیت کامیاب نہیں ہو سکا۔ڈاکٹر عاصم ثقلین نے اسی موضوع پر بی بی سی کے معروف براڈ کاسٹر جناب رضا علی عابدی سے بات کی تو ان کا کہنا بھی یہی تھا کہ ہندی فلمی گیت ہمیشہ اردو فلمی گیت ہی رہا ہے کیونکہ ابتدا میں فلمی شاعری کرنے والے شعرا اردو غزل گو سخنور تھے اور ان تمام نے فلمی گیت کی ابتدا ہی میں اس کے لئے ایسا اسلوب طے کر دیا کہ پھر گیت اس سے باہر نہ نکل سکا۔۔مقالہ نگار نے اس سلسلہ میں دینہ ضلع جہلم سے تعلق رکھنے والے بھارتی فلموں کے معروف گیت نگار جناب گلزار کا بھی ٹیلی فونک انٹرویو کیا۔اسی سوال کے جواب میں گلزار نے کہا کہ اس کی بنیادی وجوہ میں سے ایک طاقت ور وجہ یہ ہے کہ اُردو ہی وہ واحد زبان ہے جو پورے ہندوستان اور اس کے باہر بھی ایک بہت بڑی آبادی (پاکستان) میں مکمل طور پر سمجھی جاتی ہے اسی لیے فلمی گیت نگاروں نے اپنے ہر سامع تک گیت پہنچانے کے لیے ہمیشہ اُردو ہی کو وسیلہ بنایا۔مزید یہ کہ ہر شاعر نے اُردو کے ساتھ اپنی قلبی محبت کی وجہ سے دماغ میں ایک ایسی چھلنی لگا رکھی ہے کہ گیتوں میں صاف ستھری اور خالص اردو کو ہی آگے آنے دیتی ہے اور خالص ہندی لفظ اس سے الگ ہو کر باہر رہ جاتے ہیں۔ڈاکٹر عاصم نے لکھا ہے کہ موجودہ دور کے دو گیت نگار گلزار اور جاوید اختر ایسے اہم ترین نام ہیں جنھوں نے فلمی گیت کے معیار کو سنبھالا دیے رکھا اور عصرِ حاضر تک اس صنف کو پھکڑ پن سے بچانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر عاصم ثقلین کا یہ مقالہ نہ صرف یہ کہ برصغیر میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑا منفرد اور دل چسپ کام ہے بلکہ اس مقالے کے ذریعے پچھلی صدی میں کی جانے والی فلمی شاعری کو وقار اور اعتبار ملا ہے۔

عتیق الرحمٰن صفی/گجرات

آگ پینے سے لگ گئی ہے کیا
یا وہ سینے سے لگ گئی ہے کیا
کس لیے ہے یہ موت کی خواہش
آہ جینے سے لگ گئی ہے کیا
کیوں بلندی سے خوف ہے اتنا
چوٹ زینے سے لگ گئی ہے کیا
خیر ہو رکھ رکھاؤ کی صاحب
ضد کمینے سے لگ گئی ہے کیا
یہ جو چپ سی ہے آج آنکھوں میں
ہونٹ سینے سے لگ گئی ہے کیا
سرخ چہرے پہ نیل کیسا ہے
آبگینے سے لگ گئی ہے کیا
غم غلط ہو گئے سبھی یک دم
لو مدینے سے لگ گئی ہے کیا

....

جس پل ہوا یہ ایک اشارہ تو میں گیا
تو مجھ سے کر رہا تھا کنارا تو میں گیا
مشتاق تیری دید کا حد سے سوا تھا میں
اُترا جونہی نقاب تمہارا تو میں گیا
میں نے عصا سمجھ کے تمہیں ساتھ رکھ لیا
تم نے جو روپ سانپ کا دھارا تو میں گیا
میں کوزہ گر کے چاک پہ گھوما ہوں اس قدر
مجھ کو جب اس نے نیچے اُتارا تو میں گیا
تو نے بنا کے دیکھی ہیں دنیا کی رونقیں
پر تیرے اس خیال پہ وارا تو میں گیا
زندہ یہاں سے لوٹ کے جاتا نہیں تھا میں
مجھ کو پھر اس نے جان سے مارا تو میں گیا
مجھ کو زمیں پہ بھیج کے واپس بلا لیا
مجھ بن ہوا نہ اُس کا گزارا تو میں گیا
کر دی اگر انھوں نے شفاعت تو ہوگی خیر
اچھے برے کو رب نے نکھارا تو میں گیا

مظہر بخاری-شمعِ محفل تھا وہ شخص

عامر بن علی/ جاپان

مظہر بخاری شعروادب کا ایسا جاوداں حوالہ ہے جس کے بغیر ہمارے دبستان کی تاریخ نامکمل رہے گی۔خوبصورت لہجے کے میٹھے شاعراور عمدہ نثر نگار،ان کو مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ابھی کل ہی کی تو بات ہے جب ہم سکول میں زیرِ تعلیم تھے اور شعروسخن سے چھیڑ خانی کیا کرتے۔ان دنوں پتہ چلا کہ ہمارے شہر میں مظہر بخاری نام کا ایک شاعر ہے۔جو کہ پورے پاکستان کے ادبی حلقوں میں جانا جاتا ہے۔جب ملاقات ہوئی تو انہیں انتہائی مخلص اور حساس انسان پایا اوران کے بارے میں یہی تاثر تمام عمر قائم رہا۔دبلا، پتلا، دراز قد کا یہ مہذب نوجوان جو نئے لکھنے والوں اورادب میں نووارد ان کی ہمیشہ دل جوئی کرتا ہے۔سکول کے دنوں میں ان سے قائم ہونے والا احترام، محبت اور دوستی کا یہ تعلق ہمیشہ قائم رہا۔ہم شاعر لوگ محبت اوروفا کے شعر کہتے ہیں،اپنی وفاوخلوص اور چاہت پرفخر کرتے اور جتاتے ہیں۔مگر جامہ تلاشی میں یہ وفا،خلوص اور محبت کی جنس ہم سے رتی برابر بھی اگر برآمد ہی نہ ہو سکے تو پھر ہمارا سارا تخلیقی عمل مشکوک ہے۔ہم جس وفا کی تبلیغ کرتے ہیں اور جس محبت کے پرچارک ہیں وہ ہماری شخصیت اور ذات کا بھی ضروری حصہ ہونی چاہیے۔مظہر بخاری ان اہلِ علم میں سے تھے جو سراپا محبت تھے۔ان کے وجود سے تمام عمران اعلیٰ اقدار وحسن سلوک کا اظہار ہوتا رہا جس کا تذکرہ ان کی شاعری اور نثر میں ملتا ہے۔اتنی کم عمری میں ان کے داغ مفارقت دے جانے سے ان کے اہلِ خانہ اور ہم دوست تو مغموم ہیں ہی جو کہ قابل فہم اور فطری عمل ہے،مگر اس کے ساتھ ساتھ پاکستان اور بیرون ملک پاکستانیوں کا وہ حصہ جو شعروسخن سے دلچسپی رکھتا ہے مظہر بخاری کی وفات پر رنجیدہ ہے۔میرے لئے چشم تصور میں وہ منظر لانا محال ہے کہ میاں چنوں میں کوئی ادبی تقریب ہو اور اسٹیج پر نظامت کے لئے مظہر بخاری موجود نہ ہوں۔

ان جیسا ادب پرور میرے شہر کے لوگوں نے کم کم ہی دیکھا ہے۔تمام عمر شاعروں،ادیبوں کو جمع کر کے شہر میں ادبی وتخلیقی فضا قائم رکھنے کیلئے کوشاں رہے۔پاکستان کے لاتعداد شاعر اور ادیب ایسے ہیں جن سے مجھے بخاری صاحب نے متعارف کروایا۔اگر میں یاد کروں کہ میں نے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ شعری محفلوں میں شرکت کون سی جگہ پر کی ہے تو بلاشبہ وہ مقام مظہر بخاری کی بیٹھک ہے۔

توں بیلی تے سب جگ بیلی،ان بیلی وی بیلی
تیرے باج محمد بخشا نجی پئی حویلی

دوستوں کی خاطر مدارت میں ہمیشہ انہیں مستعد پایا۔بے پناہ سخی انسان تھے۔بہت بڑا دل اور دردِ دل رکھتے تھے۔مظہر بخاری کی اچانک وفات سے پیدا ہونے والا خلا ہمیشہ محسوس کیا جائے گا۔فقط یہی نہیں کہ ان کے اہلِ خانہ اور دوستوں کے لئے یہ خلا کبھی پر نہیں ہوگا۔بلکہ ادبی،علمی حلقوں میں بھی ان کی کمی کو ہمیشہ محسوس کیا جائے گا۔ایسا ہمدرد انسان کہ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر فوراً تڑپ اٹھتا،ایسا صاحب دل کہ دوسروں کے درد کو محسوس کرتا تھا۔ذاتی دکھ درد اور تکالیف کو ہمیشہ مسکرا کر اٹھانے والا اور سب سے ہمیشہ خنداں پیشانی اور خلوص سے پیش آنے والا۔مگر عدم کے الفاظ میں اہل صدق وصفا میں یہی ایک خرابی ہے۔

عدم خلوص کے بندوں میں ایک خامی ہے
ستم ظریف بہت جلد باز ہوتے ہیں

مظہر بخاری کی رحلت میرے لئے ایک ذاتی نقصان اور صدمہ بھی ہے کہ میں ایک مخلص دوست اور قابل اعتماد ساتھی سے محروم ہوگیا ہوں۔اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور جنت میں ان کا مقام اعلیٰ وبلند ہو کہ یہی ان کے لئے دعا دل سے نکلتی ہے۔بخاری صاحب! آپ کی کمی ہم تمام عمر محسوس کرتے رہیں گے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

سالِ نو

یہ جو سال ہم سے جدا ہوا
بڑی مشکلوں سے ہی طے کیا
رہا پچھلے درد کا تذکرہ
کئی غم تھے جن کا جنم ہوا
ہوں کھڑا میں تنہا یہ سوچتا
ہیں یہ آخری شبیں سال کی
نئے آنے والے برس میں کیا
جو گئی رتوں میں جدا ہوا
وہ خوشی کا لمحہ بھی آئے گا
یا کہ سال نو بھی اسی طرح
دکھی دل کا کرب بڑھائے گا

(عامر بن علی)

جدید غزل کا موضوعاتی مطالعہ- جدید موضوعات

لبنیٰ صفدر/ لاہور

عدیم الفرصتی

جدید دور کے انسان کا سب سے بڑا بڑا مسئلہ عدیم الفرصتی ہے۔ مادہ پرستی نے شب و روز مختصر کر دیے ہیں۔ ترقی کی دوڑ میں وقت ہاتھوں سے پھسلا جا رہا ہے۔ اگرچہ سائنسی ایجادات نے ہفتوں کے کام دنوں میں مہینوں کے کام ہفتوں میں اور سالوں کے کام مہینوں میں ہونے کی سہولت فراہم کر دی ہے۔ مگر پھر بھی بقول غالب:

نہ باگ ہاتھ میں ہے نہ پاؤں رکاب میں

جدید غزل میں بھی یہ موضوع اپنے اندر گہری معنویت لیے ہوئے ہے۔

وقت مانگا تھا تو نے مجھ سے دوست
وقت ہی تو نہیں بچا مرے پاس
(ندیم بھابھہ)

یہی احساس اپنی محبت کو کھو دینے کا بھی ہے۔

خود سے فرصت ہی میسر نہیں آئی ورنہ
ہم کسی اور کے ہوتے تو تمہارے ہوتے
(کبیر اطہر)

تو بھی ہو، میں بھی ہوں یک جا کہیں اور وقت بھی ہو
اتنی گنجائشیں رکھتی نہیں دنیا، مرے دوست
(اوریس بابر)

مگر کبھی کبھی اس عدیم الفرصتی میں فرصت مل جائے تو احساس بدل جاتا ہے۔ تو فرصت کے لمحے غنیمت لگتے ہیں۔

کل رات دیر تک وہ رہا محو گفتگو
مصروف میں بھی کم تھا فراغت اُسے بھی تھی
(محسن نقوی)

وقت اتنا کہاں تھا وقت کے پاس
ورنہ کرتا وہ انتظار مرا
(کاشف حسین غائر)

گنجائش افسوس نکل آتی ہے ہر روز
مصروف نہیں رہتا ہوں فرصت کے برابر
(ابراحمد ڈاکٹر)

گزشتہ عمر سے منسوب اک شناسائی
پس ہجوم گھڑی فرصتوں کو روتی ہے
(خواجہ رضی حیدر)

عدیم الفرصتی کی وجہ سے قریبی اور جان سے پیارے رشتے بھی جدید دور میں فراموش ہو رہے ہیں لیکن جدید شاعر کو اس بات کا مکمل احساس ہے کہ یہ گناہ اس سے سرزد ہو رہا ہے۔ مگر وہ اپنی موجودہ صورت حال اور حالات کے ہاتھوں مجبور ہے۔

ترے بھلانے میں میرا قصور اتنا ہے
کہ پڑ گئے تھے مجھے کام کچھ زیادہ ہی
(منصور آفاق)

لاکھ عدیم الفرصتی سہی مگر وہ ایک پل جس میں کوئی حاصل ہو جائے مکمل زندگی کا احساس لے کر آتا ہے۔

وہ ایک پل ہی سہی جس میں تم میسر ہو
اُس ایک پل سے زیادہ تو زندگی بھی نہیں
(عرفان ستار)

مدارِ وقت وہ گنجائشیں ذرا پھر سے
کہ پڑ رہیں کسی کسی دیوارِ سایہ دار کے ساتھ
(عابد سیال)

اس قدر بڑھنے لگے ہیں گھر سے گھر کے فاصلے
دوستوں سے شام کے پیدل سفر چھینے گئے
(افتخار قیصر)

تو مجھ کو کہاں میری ضرورت سے ملا ہے
بس آج ذرا تھوڑی سی فرصت سے ملا ہے
(اعجاز نعمانی)

بیٹھیں گے تیرے ساتھ بھی اے زندگی کبھی
فرصت کبھی جو عشق نے اک لمحہ بھر کو دی
(اعزاز احمد آذر)

جدید دور کے انسان کا سب سے بڑا المیہ ہی یہی ہے کہ اس کے پاس محبت کرنے کے لیے بھی وقت نہیں رہا۔ اوپر سے نفرت کی تیز آندھی جو کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لیتی۔

اک عداوت سے فراغت نہیں ملتی ورنہ
کون کہتا ہے محبت نہیں کر سکتے ہم
(سرفراز زاہد)

انسان کی یہ خواہش تو روزِ اوّل سے ابد تک رہے گی۔

عمر بھر ساتھ رہے وہ میرے
عمر بھر ایک ہی مہلت چاہوں
(صغرا صدف)

اور ایک لڑکی کی مصروفیت گھر داری اور صرف گھر داری بھی ہوتی ہے۔

نپٹتے ہی نہیں ہیں کام گھر کے
ذرا سی دیر فرصت چاہتی ہوں
(لبنیٰ صفدر)

خوف و دہشت

کائنات کی وسعتوں کو اگر دیکھا جائے تو اس میں انسان کا وجود لایعنی حیثیت رکھتا ہے۔ صرف زمین کی وسعت اور اس کے دامن پر دشت و صحرا کی دہشت اور پہاڑوں کی وحشت کم نہیں اس وسیع کرۂ ارض پر انسان کا ابتدا میں رہنا خوف اور دہشت کے

حصار میں رہنا تھا۔ آج جبکہ انسان ستاروں پر کمند ڈال رہا ہے۔ مگر وہ ابتدائی خوف و دہشت اب بھی اُس کے لاشعور میں پنہاں ہے۔ جدید دور کے خوف بھی الگ ہیں اور اُن کی دہشت بھی الگ ہے۔

کیا بھروسہ ہے سمندر کا خدا خیر کرے
سیپیاں چننے گئے ہیں مرے سارے بچے
(بیدل حیدری)

وطن عزیز کے حوالے سے دیکھا جائے تو جدید غزل کے موضوعات میں دہشت گردی کی وجہ سے خوف بھرپور استعارہ بن چکا ہے۔

نماز پڑھنے کے مہلت ہمیں ملے نہ ملے
نجانے وقت اذاں کون مارا جائے گا
(نسیم سحر)

بہار آئے تو شاخوں پہ پھول گن لینا
میں کیا بتاؤں مرے کتنے یار مارے گئے
(نامعلوم)

سبھی کو برسرِ پیکار مت کر
یہ میرا شہر ہے مسمار مت کر
(قمر رضا شہزاد)

تاریخ کے صفحات اُلٹ کر دیکھیں تو مسلمان ہی اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ برسرِ پیکار رہے۔ جدید غزل میں یہ موضوع بھی مکمل معنویت کے ساتھ پیش ہوا ہے۔

خود اپنے ہاتھ کی ہیبت سے کانپ جاتا ہوں
کبھی کبھی کسی دشمن پہ وار کرتے ہوئے
(آفتاب حسین)

یہ ڈر یہ خوف کسی کے ساتھ محبت میں اس کے حوالے سے اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔

وہ مرنے سے بہت ڈرنے لگا ہے
اُسے اتنی محبت دے رہا ہوں
(حسن عباسی)

کسی حادثے کی خبر ہوئی تو فضا کی سانس اکھڑ گئی
کوئی اتفاق سے بچ گیا تو خیال تیری طرف گیا
(لیاقت علی عاصم)

محبت میں ایک خوف اُمید اور توقع پوری نہ ہونے کا بھی ہوتا ہے۔

اس ڈر سے اشارہ نہ کیا ہونٹ نہ کھولے
دیکھے کہ نہ دیکھے کوئی بولے کہ نہ بولے
(رام ریاض)

اور ہمارے معاشرے میں جو محبت کے حوالے سے جبر کا موسم ہے اور اس موسم میں گندھی ہوئی جو محبت کی کہانیوں کے کردار ہیں۔ وہ علامتی انداز میں جدید غزل کا یوں موضوع بنے ہیں۔

رات کو پھر سے گھڑا بجنے لگا ہے قاسمؔ
گاؤں میں پھر کسی مُیار کے دن تھوڑے ہیں
(قاسم شاہ)

اندر کا خوف روزِ ازل سے انسان کو دامن گیر ہے۔ جدید دور میں یہ خوف اور بھی توانا ہو گیا ہے۔

عجیب خوف ہے اندر کی خامشی کا مجھے
کہ راستوں سے گزرتی ہوں گنگناتے ہوئے
(شہناز نور)

اک اور شخص ذات کے اندر لگا مجھے
میں کیا بلا ہوں رات بہت ڈر لگا مجھے
(ظفر اقبال)

کچھ ہونے کے خوف سے خوف کے اندر کچھ نہ ہونے کا خوف زیادہ خوفناک اور وحشت ناک ہے۔ جس سے بعض اوقات انسان دوچار ہو جاتا ہے۔

رات پھر اک چاپ سی پھرتی رہی چاروں طرف
جان لیوا خوف تھا لیکن ہوا کچھ بھی نہیں
(ظہور نظر)

پس شکست جو پسپائی کا سوال آیا
میں ہر محاذ پہ چشموں میں زہر ڈال آیا
(فیصل عجمی)

احساسِ تفاخر

تفاخر کا احساس انسان میں روزِ ازل سے ہے۔ قبیلے ذات کی پہچان کے لیے بنائے گئے۔ اگرچہ اسلام میں برتری کا معیار صرف تقویٰ ہے۔ پھر بھی مختلف ذاتوں اور قبیلوں کو مختلف ذاتوں اور قبیلوں پر برتری حاصل رہی ہے۔ یہی برتری تفاخر کا احساس پیدا کرتی ہے۔ حکمران طبقے کے افراد محکوم طبقے کے افراد سے معتبر رہے۔ اسی طرح پیغمبروں کو بھی سب سے اعلیٰ خاندانوں میں پیدا کیا گیا۔

پیشہ ہزار پشت سے آبا سپہ گری
کچھ شاعری ہی ذریعہ عزت نہیں مجھے
(غالبؔ)

یہی احساسِ تفاخر جدید غزل میں الگ انداز اختیار کر گیا ہے۔

میں نہیں مانتا کاغذ پہ لکھا شجرۂ نسب
بات کرنے سے قبیلے کا پتہ چلتا ہے
(محمد محمود احمد)

اے مرے دوست ذرا دیکھ میں ہارا تو نہیں
میرا سر بھی تو پڑا ہے مری دستار کے ساتھ
(سعداللہ شاہ)

میرے معیار کا تقاضا ہے
میرا دشمن بھی خاندانی ہو
(اختر شمار)

بعض اوقات احساسِ تفاخر، احساسِ کمتری کا شاخسانہ بھی ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر افتخار بخاری

''احساس کمتری یہ ہے کہ ہر شخص خاص بننے کے چکر میں ہے اور وہ کسی نام نہاد باطنی شے کو تلاش کر کے خاص ہو جانا چاہتا ہے۔'' (۳۱)

یہی احساسِ تفاخر کبھی کبھی احساسِ زیاں میں ڈھلتا دکھائی دیتا ہے۔

ہمیں چاہو ہماری قدر کر لو
تمہارے درمیاں بیٹھے ہوئے ہیں
(خورشید رضوی)

خواتین شاعرات کے ہاں بھی احساسِ تفاخر موجود ہے۔مگر جب آج کی عورت کو کچلا جاتا ہے تو یہ احساس احتجاج بن جاتا ہے۔

تمہارے ہاتھ لگے ہیں تو جو کرو سو کرو
وگرنہ تم سے تو ہم سو غلام رکھتے تھے
(نوشی گیلانی)

خالی احساس تفاخر بھی صرف ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

جینے میں جو احساس تفاخر ہے کہاں ہے
جیتے چلے جانے کی ندامت کے برابر
(ابرار احمد ڈاکٹر)

اور جب یہ احساسِ تفاخر بھی ختم ہوتا دکھائی دے تو یہ احساس جنم لیتا ہے۔

عشق آباد فقیروں کی انا رکھتے تھے
اور کیا اس کے سوا اہل وفا رکھتے تھے
(نجیب احمد)

ستون اپنے شکوہِ رفتہ میں گم کھڑا ہے
بس اک انہماک ٹوٹے گا پھر گرے گا
(خالد اقبال یاسر)

یہ انہماک ٹوٹنے کی دیر ہوتی ہے کہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے۔بقول ڈاکٹر افتخار بخاری:

''آ گہی کا المیہ یہ بھی ہے کہ آ گہی اور ادراک کے بعد کئی لوگ احساسِ تفاخر کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کا آ گہی کا سفر رُک جاتا ہے۔''(۳۲)

دوسری طرف احساسِ تفاخر انسان کو انفرادیت کی طرف لے جاتا ہے۔

شکیبؔ اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے
ہم اُس سے بچ کے چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے
(شکیب جلالی)

اور یہ بھی تو احساس تفاخر کی ہی ایک صورت ہے۔

راہ میں پتھر جو رکھتے ہیں کوئی ان سے کہے
میں گزر جاؤں گا یہ پتھر پڑے رہ جائیں گے
(دلاور فگار)

مگر وہ ہم تھے کہ لائے تھے اُس الاؤ سے آگ
وہاں سے راکھ تو اب کوئی جا کے لے آئے
(احمد حسین مجاہد)

مجھے بتا! مری وسعت میں کیا کمی آئی
یہ شرق و غرب جنوب و شمال ہونے سے
(اکبر معصوم)

نہیں قبول مجھے قرض کا تموج بھی
میں اپنی موج میں رہ کر بھنور بناتا ہوں
(اختر عثمان)

ہجرت

ہجرت کا موضوع ادب کا سب سے شاداب اور بڑا موضوع ہے۔کیونکہ انسان زمین پر محض مجبُور ہے۔کبھی جنگوں کبھی روزگار کبھی مذہب اور کبھی دیگر حالات کے باعث اپنی زمین اپنے خطے سے ہجرت پر مجبُور کر دیا جاتا ہے۔اس لیے روایتی شاعری میں ہجرت کا دکھ اور جدید شاعری میں کئی حوالوں سے آیا ہے۔

اب تو جاتے ہیں مئے کدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا
(میر تقی میرؔ)

جدید موضوعات میں ہجرت سب سے اہم موضوع ہے۔کیونکہ عالمی اور ملکی حالات کے پیشِ نظر اس خطے کے لوگوں کو بار بار ہجرت پر مجبُور ہونا پڑا۔

ہجر مسلسل اور مسلسل ہجرت بھی
روز مجھے سامان اُٹھانا پڑتا ہے
(حسن عباسی)

کل پردیس میں یاد آئے گی دھیان میں رکھ
اپنے شہر کی مٹی بھی سامان میں رکھ
(اظہر ادیب)

بقول گوپی چند نارنگ:

''ہجرت صرف زمینوں، زمانوں، آبادیوں اور بستیوں سے نہیں ہوتی۔خود اپنی ذات سے بھی ہوتی ہے۔پاؤں صرف چلنے کے لیے ہیں، قدموں سے ہم صرف مکاں ناپتے ہیں۔مکاں چلتے ہیں لیکن ذہن جست لگاتا ہے اور آن واحد میں وجود کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ساری زمینیں اور زمانے اپنی بساط تہہ کر لیتے ہیں۔کائنات سمٹ کر نقطہ بن جاتی ہے یا پھر کراں تا کراں پھیلا ہوا ایک لامختتم بھید فن معلوم اور نامعلوم کے ایسے مقامات پر جنم لیتا ہے۔''(۳۳)

اس گلی نے یہ سن کے صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں
(جون ایلیا)

اپنی منزل اُٹھا کے شانوں پر
چل رہے ہیں کہ راستہ آئے
(مقصود وفا)

لیکن بعض اوقات جبر کی صورت حال اور حالات میں عجیب موڑ آتا ہے کہ جو جدید شاعری میں ہجرت کے حوالے سے ایک اچھوتے خیال کی نمائندگی کرتا ہے۔

اذاں پہ قید نہیں بندشِ نماز نہیں
ہمارے پاس تو ہجرت کا بھی جواز نہیں
(انجم خیالی)

ہجرت ایک خواب کے ساتھ کی جاتی ہے۔امن اور خوش حالی کا خواب اگر وہ پورا نہ ہو تو احساس زیاں اور بھی بڑھ جاتا ہے۔جدید شعرا کے ہاں یہ احساسِ زیاں بہت ہے۔

میں بہت کمزور تھا اس ملک میں ہجرت کے وقت
پھر مجھے کمزور سے کمزور تر اس نے کیا
(منیر نیازی)

لوگ ہجرت کر گئے آباد گھر خالی ہوئے
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے نگر خالی ہوئے
(ریاض مجید)

جانے اُس گھر کے مکیں کس دیس پہنچے کیا ہوئے
رہ گئے دیوار پر لکھے ہوئے بچوں کے نام
(پیرزادہ قاسم)

کبھی کبھی ہجرت چار دیواری کے اندر بھی ہوتی ہے۔ یہ ذات کی ہجرت ہوتی ہے۔

یہ اور بات کہ موجود اپنے گھر میں ہوں
میں تیری سمت مگر مستقل سفر میں ہوں
(ناصر علی سیّد)

کسی سے وعدہ و پیماں بھی نہیں میرا
یہ شہر چھوڑنا آسان بھی نہیں میرا
(قمر رضا شہزاد)

سات سمندر پار بھی میری آنکھیں میرے ساتھ نہ آئیں
چاروں جانب خواب ہیں میرے اور پرایا شہر
(افتخار قیصر)

یہ تو اُس کا کمال ہے ورنہ
میں تو اپنے ہی گھر میں رہتا تھا
(تبسم شہزاد)

ہجرت کا سامان نہیں تھا
رستہ بھی آسان نہیں تھا
(لبنیٰ صفدر)

وطن پرستی

انسان ابتدا سے ہی قبیلوں میں تقسیم ہو کر رہا ہے جس میں ہر قبیلے کے اپنے اصول وضوابط اور قوانین ہوتے تھے۔ پھر جیسے جیسے وہ مہذب ہوتا گیا۔ اُس نے اپنے کلچر اور قوم کے لحاظ سے طاقت کے زور پر زمین پر سرحدیں بنا لیں۔ اس سے ملک وجود میں آئے جو کہ قبیلے کی وسیع شکل میں ہیں۔ ماضی میں قبیلوں کے درمیان اپنے اپنے مفاد پر جنگیں ہوتی تھیں اور اب ملکوں میں ہوتی ہیں۔ ہر ملک اپنی عوام میں وطنیت کا جذبہ اس قدر اُبھارتا ہے کہ وہ قوم اُس پر جان و مال قربان کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ اس لیے روایتی شاعری سے لے کر جدید شاعری تک وطن کے حوالے سے نت نئے مضامین غزل کا حصّہ بنتے رہے ہیں۔

پاکستان کے سارے شہرو زندہ رہو، پائندہ رہو
روشنیوں، رنگوں کی لہرو زندہ رہو، پائندہ رہو
(منیر نیازی)

کہیں بھی گھر بسا لینا جہاں میں
مگر اپنے وطن کو یاد رکھنا
(فیضان عارف)

پاکستان کے قیام کے بعد اس خطے کے مسلمانوں کو نیا وطن ملا جو کہ کسی نعمت سے تو کم نہیں تھا۔ مگر یہ قوم ایک خون کے دریا سے بھی گزری اور جو لوگ اس میں سے گزرے وہ تقسیم کے حالات آنے والی نسلوں کو بتاتے تھے۔ مگر 70 برس گزرنے کے بعد اُن میں زیادہ تر لوگ مر گئے ہیں۔ اس احساسِ زیاں کو جدید شاعری میں محسوس کیا جا رہا ہے۔

اب تو وہ نسل بھی معدوم ہوئی جاتی ہے
جو بتاتی تھی فسادات سے پہلے کیا تھا
(شناور اسحاق)

بقول ڈاکٹر مظفر عباس:

''نئی نسل کے علامت پسند شعرا کی شاعری میں بھی قومی شاعری کے اثرات ملتے ہیں لیکن اُن کی علامت پسندی ان اثرات کو بہت زیادہ نمایاں نہیں ہونے دیتی۔ بہر حال نئی نسل کے چند شعراء کے کلام کے تجزیے سے ہم اس نسل کے تمام شعرا کی قومی شاعری کا اندازہ کر سکتے ہیں۔'' (۳۴)

پاکستانی جدید تر نسل کے شاعروں کے کلام کو بجا طور پر روح عصر کا نقیب کہا جا سکتا ہے۔ معاصر صورت حال کا ادراک اور تفہیم ان کی غزل میں بہت نمایاں ہے۔

احساسِ زیاں

انسان خسارے میں ہے۔ احساسِ زیاں اس لیے ہمہ وقت اُس کے ساتھ ہے۔ انسان کی پہچان یہ ہے کہ وہ غلطی کرتا ہے اور جب وہ غلطی کرتا ہے تو اُسے زیاں سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ احساسِ زیاں بہت تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتا ہے اور احساسِ زیاں اُس سے بھی زیادہ جان لیوا ہوتا ہے۔

سن یہ رونا نہیں گرانی کا
یہ تو بے قیمتی کا رونا ہے
(اجمل سراج)

رات کی نذر ہو گئے ہم بھی
آخرِکار سو گئے ہم بھی
(شہرت بخاری)

اور جب کسی کے کھو جانے کا یقین ہونے لگے تو احساسِ زیاں رائیگانی میں ڈھلنے لگتا ہے۔ محض مجبور انسان اُس وقت سوائے صدا لگانے کے کیا کر سکتا ہے۔

آواز دے کے دیکھ شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ زندگی کا سفر رائیگاں تو ہے
(منیر نیازی)

اپنی ذات کے دکھ درد کے حوالے سے زیاں کے بعد کا احساس زیاں خواتین شاعرات کے ہاں زیادہ شدت کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔

آبروئے ادب - جناب اقبال راہی

علی حسین عابدی/ لاہور

شاعری لطیف جذبات کے اِظہار کا نام ہے زندگی کی شاہراہ کے اونچے نیچے راستوں سے گزرتے ہوئے اِنسان دُکھ سہتا اور سُکھ اُٹھاتا آگے بڑھتا رہتا ہے عام طور پر یہ عمل صرف جادہ پیمائی تک محدود رہتا ہے مگر کوئی اِنسان راستے کے پیچ وخم, دشواریوں اور سختیوں کو محسوس کرتا ہے, دشواریوں کا حل سوچتا ہے اُفتاد کے اصول وضع کرتا ہے یہ کام مفکروں، دانشوروں اور اہلِ فکر ونظر کا ہے اِسی قافلے کا ایک اہم کردار شاعر بھی ہے۔

شاعری ایک حساس موضوع ہے جسے اِس بے حِس اور مادیت پرست دور میں دردِ دِل اور ذوق رکھنے والے لوگ ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں آسمانِ ادب پر ستاروں کی خوبصورت کہکشاں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ چمک دمک رہی ہے اِن چمکتے تاروں میں کبھی کوئی تارا جلنے بجھنے لگتا ہے تو کبھی کوئی تارا دھیرے دھیرے اپنی روشنی کھو دیتا ہے اور دور کہیں آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے ایسے میں ہماری سانسیں رکنے لگتی ہیں اُردو ادب کی تاریخ بہت پرانی ہے اس تاریخ کے دامن میں بیش قیمت موتی پنہاں ہیں جس میں ایک نام استاد الشعراء جناب حضرتِ احسان دانش کا ہے۔

احسان دانش صاحب کی شخصیت ادب میں اپنے تئیں ایک یونیورسٹی کا درجہ رکھتی ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ حضرتِ احسان دانش کے حوالے سے کوئی خاطر خواہ کام نہیں کیا گیا جس طرح ہونا چاہیئے تھا ہماری ادبی تنظیمیں اور حکومتی ادارے اس سلسلے میں کوئی خاص پیش رفت نہیں کر سکے جو کہ انتہائی افسوس کی بات ہے ہماری آنے والی نسلیں جو پہلے ہی جدید ٹیکنالوجی کے ہاتھوں یرغمال بنی ہوئی ہیں اُنہیں کیا خبر کہ کتنے عظیم لوگ اِس دھرتی کے سینے پر علم وشعور و آگہی کے چراغ روشن کرتے رہے ہیں۔

حضرتِ احسان دانش کی جھلک اُن کے شاگردِ دلاور استاد فی البدیہہ شاعرِ بے مثل جناب اقبال راہی صاحب میں بھرپور انداز میں نظر آتی ہے راہی صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں جن کا احاطہ کرنا مجھ جیسے طفلِ مکتب کے بس کی بات نہیں راہی صاحب کی زندگی جدوجہد دُکھوں اور غم سے عبارت ہے ہر لمحہ ہر آن لبوں پر مسکراہٹ سجائے خوش دِلی اور خندہ پیشانی سے ملنا راہی صاحب کا خاصہ ہے کہ سامنے والا نہ صرف اُن کا مداح بن جاتا ہے بلکہ راہی صاحب کے ساتھ دِلی لگاؤ کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے زندگی کے نشیب وفراز اُونچ نیچ اُتار چڑھاؤ اقبال راہی کے حوصلوں کو کبھی پست نہیں کر سکے بلکہ اُنہیں ہمیشہ شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اولاد کا غم بڑا غم ہے صحیح معنوں میں کہا جائے تو یہ غم کہیں کا نہیں چھوڑتا اولاد کا غم سینے میں لئے لبوں پر مسکراہٹ کے پھول نچھاور کرنے والے راہی صاحب کے بارے سامنے والے کو کیا خبر کہ اس سینے میں کتنے الاؤ جل رہے ہیں جو نہ کبھی بجھ سکتے ہیں نہ کبھی اِن کی حدت میں کمی آ سکتی ہے جواں سال بڑے بیٹے فیصل اقبال کی بے وقت موت نے گویا اقبال راہی کی زندگی میں مستقل غم کی نوید سنا دی تھی اُس کے بعد جواں سالہ بیٹی نیلم اقبال تھلیسیمیا کے مرض میں مبتلا باپ کے چہرے پر بڑھاپے کو عیاں کر گئی یہ غم ابھی کم نہیں ہوا تھا کہ جوانی کے شباب میں قدم رکھنے والا صاحب دیوان بیٹا فرحان اقبال تھلیسیمیا جیسی موذی مرض کے ہاتھوں داغِ مفارقت دے گیا اور اب اُن کا جواں سال بیٹا عالمِ شباب میں کامران اقبال تھلیسیمیا جیسی جان لیوا مرض کے ہاتھوں ہر روز لڑتے ہوئے زندگی کو آگے دھکیل رہا ہے یقین مانیئے دِل خون کے آنسو روتا ہے پروردگار اقبال راہی صاحب پر اپنا فضل بنائے رکھے اور کامران اقبال کو صحتِ کاملہ عطا فرمائے آمین

راہی صاحب نے ہمیشہ محبتوں کے گلاب کِھلائے ہیں خلوص عاجزی اور صلہ رحمی جیسے اوصاف کی آبیاری کی ہے نمبر گیم کے چکر سے خود کو دور رکھا کبھی دِل میں شہرت جیسی بے وقعت چیز کو جگہ نہیں دی یہ بات بظاہر بہت تلخ ہے لیکن سچ یہی ہے کہ ہمیں بڑے شاعر تو جا بجا نظر آتے ہیں لیکن بڑے انسان کا ملنا خال خال ہے۔ اقبال راہی صاحب بلا شبہ ایک بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے انسان ہیں راہی صاحب نے ہمیشہ ادبی پروگراموں مشاعروں میں میزبان کی حیثیت سے شرکت کی صدارت جیسے اعزاز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بے رخی کا اظہار کیا کوشش کی کہ کوئی نوجوان دوست اس منصب پر اپنے فرائض انجام دے اس میں زیادہ خوشی محسوس کرتے ہیں مشاعروں اور دیگر ادبی تقریبات میں اپنے فی البدیہہ جملوں اور اشعار سے محفل میں چار چاند لگا دینا اُن کا خاصہ ہے اتنی محبت سے بات کرتے ہیں کہ لکھنے والے کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے اور شخصیت میں کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔ راہی صاحب کا ذہن نوکِ زباں پر رکھا رہتا ہے حاضر جوابی ایسی کہ۔ واہ بھئی واہ۔ نگاہ عقابی مگر آنکھ کی پتلی کے اندر اِضطراب کا ایک سمندر بند ہے محفل میں موجود کوئی شخص اِن کی نگاہ کے زاویے سے بچ کر نہیں جا سکتا جیسا آدمی ویسا جملہ پتہ نہیں لگتا کہ شخصیت پہلے سامنے آئی یا اُنہوں نے جُملہ پہلے ساخت کیا یا کہ وہ فقرہ گر ہیں بلکہ فقروں کے بادشاہ ہیں مزاح اِس طرح کا کہ ہنسی رکتے نہیں رکتی ایک ہاتھ منہ پر اور دوسرا پسلیوں پر رکھنا پڑتا ہے اس سال اقبال راہی صاحب کو ادب کی خدمت کرتے ہوئے

پچاس سال مکمل ہو گئے ہیں یہ پچاس سال ادب کی خدمت کرتے گزر گئے راہی صاحب نے پہلا مشاعرہ غالباً 1975 میں پڑھا جس کا اہتمام اُس وقت کے وزیرِ خوراک ملک خدا بخش بُچہ نے کیا اور مشاعرے کی صدارت استاد قمر اجنالوی نے کی اور مہمانِ خصوصی حضرتِ احسان دانش تھے پہلا شعری مجموعہ کلام۔۔ زندہ حروف۔۔ 1988 میں شائع ہوا جسے گولڈ میڈل سے نوازا گیا اُس کے بعد۔ ''پھول پھول خوشبو'' انتخاب شائع ہوا قطعات پر مشتمل مجموعہ کلام۔ ہائے الٹ پاکستان۔۔ پھر۔۔۔ قطعہ برید۔۔ قطعات جس کا نام مرحوم اعزاز احمد آذر نے تجویز کیا شعری مجموعہ۔ شُل۔۔۔ شائع ہوا اور اب روزنامہ اوصاف لاہور کے ادارتی صفحے پر روزانہ کی بنیاد پر شائع ہونے والے قطعات پر مشتمل خوبصورت ادبی گلدستہ۔۔ پاکستان کا روزنامچہ۔ کے نام سے معروف شاعرہ زرقا نسیم غالب نے اعزازی طور پر اپنے ادارے زرقا پبلیکیشنز کے زیرِ اہتمام شائع کیا ہے بچوں کے حوالے سے اقبال راہی صاحب نے بہت عمدہ ادب تخلیق کیا ہے چند اماموں۔ کھلونا۔ بچوں کا باغ۔ جیسے نامور ادبی جرائد میں مسلسل لکھتے رہے مزاح کے حوالے سے شائع ہونے والے رسالے۔ قہقہہ میں مزاح نگاری کے حوالے سے ادبی خدمات انجام دیں ہفت روزہ نیا پیام میں قلمی خدمات انجام دیتے رہے روزنامہ مغربی پاکستان جس کے چیف ایڈیٹر قمر اجنالوی تھے اس میں ادبی ایڈیشن اور اداریہ لکھنے کی ذمہ داری بخوبی نبھائی ہفت روزہ استقلال۔ لیل و نہار۔ اور امروز میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھاتے رہے روزنامہ افلاک سے قطعہ نگاری کا آغاز کیا اس کے بعد کوہستان میں قطعہ نگاری شورش کاشمیری کے پرچہ چٹان میں باقاعدہ ملازمت اختیار کی اور اپنی صلاحیتوں کو ادارے کے لیے وقف کر دیا روزنامہ۔ تحفہ۔ گوجرانوالہ

فلم لائٹ۔ ڈرامیکٹر۔ فلمی۔ شمع رسالہ لاہور اور کراچی میں باقاعدہ لکھتے رہے راہی صاحب اب گزشتہ آٹھ (8) سال سے روزنامہ اوصاف لاہور کے ادارتی صفحے پر قطعہ نگاری کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور اس کے علاوہ ماہنامہ تارکینِ وطن انٹرنیشنل لاہور میں بطور ایڈیٹر کام کر رہے ہیں اگر دیکھا جائے تو راہی صاحب کی پچاس سالہ زندگی قلم و قرطاس کے گرد گھومتی نظر آتی ہے یوں تو راہی صاحب کو بیسیوں ایوارڈز ملے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ راہی صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں پرائیڈ آف پرفامنس جیسے معتبر اعزاز سے نوازا جانا چاہیے کیونکہ راہی صاحب کے فن پر ایک ایم فل منہاج یونیورسٹی لاہور سے ہمایوں شاہد نے مکمل کیا ہے راہی صاحب کی سوانح عمری کے حوالے سے شائع ہونے والی کتاب کی ذمہ داری (ایڈیشنل آئی جی) پنجاب جناب غلام رسول زاہد صاحب نے لی ہے مجھے یقین ہے یہ کتاب ادب کے گلشن میں نمایاں پھول کی حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب ثابت ہو گی۔۔ قطعات کا نیا مجموعہ ء کلام۔۔۔ پاکستان کا روزنامچہ۔۔ پڑھنے کے لائق ہے راہی صاحب کی ملکی سیاست اور معاشرتی ناانصافیوں اور سیاست کے داؤ پیچ کے نتیجہ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر گہری نظر ہے کتاب کے مطالعے سے قاری کی سوچ کے دھارے حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔

ویسے تو یہ کام خود راہی صاحب اپنی سوانح عمری لکھتے وقت انجام دیں گے لیکن احباب کی دلچسپی کے باعث اقبال راہی صاحب سے عقیدت و محبت رکھنے والے افراد کے نام لینا چاہوں گا

احسان دانش۔ ساغر صدیقی۔ شورش کاشمیری۔ مناظر حسن نظر۔ شریف شیوا۔ آغاز برنی۔ کلیم عثمانی نذیر نقش۔ اقبال کیفی۔ شفیق کوٹی۔ کنول فیروز۔ قتیل شفائی۔ احمد ندیم قاسمی۔ عطا الحق قاسمی۔ جوش ملیح آبادی۔

نوابزادہ نصر اللہ۔ حفیظ تائب۔ اشفاق احمد۔ منیر سیفی۔ خالد احمد۔ نجیب احمد۔ امجد اسلام امجد۔ دلدار پرویز بھٹی۔ مہندی حسن۔ عطا اللہ عیسیٰ خیلوی۔ انجم رومانی۔ جسٹس نسیم حسن شاہ۔ شہرت بخاری۔ منیر نیازی۔ احمد فراز۔ پروین شاکر۔ نوشی گیلانی۔ حمیدہ شاہین۔ بشریٰ انصاری۔ ڈاکٹر خورشید رضوی۔ ڈاکٹر خواجہ زکریا ڈاکٹر اجمل نیازی۔ باقی احمد پوری۔ ڈاکٹر جمیل جالبی۔ اعزاز احمد آذر۔ احمد راہی۔ ایس ایم ظفر۔ ڈاکٹر طارق عزیز۔ انور سدید۔ مشکور حسین یاد۔ غلام رسول زاہد۔ راجہ رشید محمود۔ ڈاکٹر نثار ترابی۔ ابصار عبدالعلی نقش ہاشمی۔ عنایت حسین بھٹی۔ قاضی جاوید۔ میاں منظور شاہد۔ کیپٹن عطا محمد صغریٰ صدف صوفیہ بیدار۔ شوکت علی۔ راشد محمود۔ عاصم بخاری۔ تاثیر نقوی۔ نعمان منظور۔ اعجاز رضوی۔ فرحت عباس شاہ۔ عارفہ صبح خان۔ سلیم اختر۔ خالد شریف۔ خالد جاوید جان۔ اعتبار ساجد۔ کرامت بخاری فیصل زمان چشتی۔ زرقا نسیم غالب۔ عروج زیب۔ پروین سجل۔ آصف جاوید کمانڈو۔ فراست بخاری۔ لبنیٰ صفدر۔ حسن عباسی۔ منزہ سحر۔ ماہا نسیم۔ اقبال پیام۔ ڈاکٹر ایم ابرار۔ عامر بن علی۔ مرتضیٰ برلاس۔ محمد ظہوری۔ جیسے سینکڑوں احباب سے ملاقات ملنا ملانا اور عقیدت کا رشتہ ہے اقبال راہی صاحب لفظوں کے دیپ جلانے کے لیے روشنی مستعار نہیں لیتے بلکہ روشنی خود ان کے اندر سے پھوٹتی ہے اور تاریک ذہن و دل کو منور کرتی چلی جاتی ہے راہی صاحب ادب میں ایک بزرگ کی حیثیت کے ساتھ سائبان کی طرح ہیں بلاشبہ اقبال راہی صاحب۔۔ آبروئے ادب ہیں پروردگار ان کا سایہ ہم پر بنائے رکھے اور ہمیں علم کے موتی اپنے دامن میں بھرنے کی توفیق عطا فرمائے۔۔۔ پاکستان کا روزنامچہ۔ کی اشاعت پر راہی صاحب کو مبارکباد اور صحت و سلامتی کی ڈھیروں دعائیں۔

ایک کثیر الجہات ادبی شخصیت اُستاد الشعراء حضرت مولانا کرم حسین مخمورؒ

قاسم خیال / بھلوال

مرثیے کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ بذاتِ خود انسان کی تاریخ ادب میں یہ صنف عرب سے منتقل ہوئی عرب میں مرثیے کو نوحے کا حصہ ہی سمجھا جاتا تھا مرثیے میں مرنے والے کا حسب نسب، خاندانی پس منظر اور اس کے نظریات پہ روشنی ڈالی جاتی ہے جبکہ نوحے میں صرف مصائب وآلام کا تذکرہ ہوتا ہے لیکن بعض انتہا پسند شعراء کرام نے نوحے کو صرف شہدائے کربلا کے مصائب وآلام کے لیے ہی مختص کر دیا۔ نوحے میں حضرت امام حسین اور آپ کے جانثاروں پر کربلا میں ڈھائے جانے والے مظالم اور دکھوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ مرثیہ اور نوحہ میں دوسرا فرق یہ ہے کہ مرثیہ صرف تحت اللفظ پڑھا جاتا ہے جبکہ نوحہ ترنم کے ساتھ پڑھا جاتا ہے پاکستان میں اس صنف کے حوالے سے بے شمار نام مشہور ہوئے انھی میں سے ایک نام مولانا کرم حسین مخمور صاحب کا بھی ہے آپ ۱۹۰۶ء میں بھیرہ میں پیدا ہوئے آپ کے والدین کا پیشہ کاشتکاری تھا آپ کا تعلق ایک غریب محنت کش خاندان سے تھا آپ کی والدہ ماجدہ گاؤں کے بچوں کو قرآن کی تعلیم دیتی تھیں اور والد کھیتی باڑی کرتے تھے آپ کے والد کا نام کریم خان تھا جو کہ بہت عمدہ شعری ذوق رکھتے تھے آپ کے دادا لال خان صاحب ایک قادر الکلام فارسی شاعر تھے آپ کو شاعری وراثت میں ملی تھی اسی لیے پھر آپ نے ساری عمر صرف شاعری ہی کی فقہ اثنائے عشریہ سے تعلق کی بنا پر آپ کے والدین نے آپ کا نام کرم حسین رکھا آپ شاعری میں اپنا تخلص مخمور کرتے تھے رواج کے مطابق آپ نے عربی اور فارسی کی تعلیم گاؤں کے مدرسہ میں حاصل کی آپ دوری طالب علمی میں ہی غیر معمولی ذہانت کے حامل ثابت ہوئے علم عروض، صرف ونحو، بدیع وبیان اور منطق کا علم حاصل کیا آپ نے علم عروض اور صرف ونحو پر کتابیں بھی لکھی آپ کا سرمایہ کتب جس میں آپ کا دیوان بھی شامل تھا آپ کے ایک ناخلف شاگرد مظہر اقبال بھٹی نے کہیں گم کر دیا جس کا قلق مخمور پاکؒ کو ساری عمر رہا ۱۹۳۰ء میں المخمور لائبریری کی داغ بیل ڈالی یہی وجہ ہے کہ راقم الحروف کو مخمور لائبریری کے لیے پورے پاکستان سے احتراما کتابیں بھجوا دی جاتی ہیں آپ نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو پہلے پہل غزل میں طبع آزمائی کی پھر مسدس، مخمس، اور مثنوی بھی لکھی لیکن بعد میں پھر آپ کا جھکاؤ مرثیے کی طرف ہو گا اور آپ نے ادب کو اپنے مذہبی عقائد کی ترویج کا ذریعہ بنالیا اور پھر وہی آپ کی پہچان بن گئی اور یہی وجہ ہے کہ ایک بڑا دماغ ایک دائرے میں مقید ہو گا ٹھیک اُسی طرح جیسے محسن نقوی صاحب ہوئے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کو مسلکی سطح پر پزیرائی تو ملی لیکن قومی یا بین الاقوامی سطح پر آپ کے کام کو نہیں سراہا گیا اور یوں آپ کا تمام کام تعصب کی نظر ہو گا آپ کو شاعرِ اہل بیت کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے آپ کے چچا زاد بھائی حسرت جعفری بھی بھیرہ کے ایک نامور شاعر تھے اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو کالے خان جیسے تھڑیے لوگ بھی مخمور پاک کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں سرکار کی منکسر المزاجی کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ کہیں دور دراز علاقے میں خطاب کرنے گئے اُن دنوں ٹرین کا سفر ہوا کرتا تھا آپؒ اپنے شاگردان کو سبق یاد کروا رہے ہیں کہ اچانک ڈبے میں سے کچھ لوگ سرکار کا محاصرہ کر لیتے ہیں اور سرکار اپنے ایک شاگرد کالے خان کو سبق دے رہے ہیں جبکہ لوگوں پہ یوں ظاہر کرتے ہیں جسے سرکار استاد نہ ہوں بلکہ شاگرد ہوں بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔۔ یہ لوگ تھے کہ خون رُلاتی ہے جن کی یاد۔ بیٹھو جو دو گھڑی تو تمہیں بھی رُلائیں ہم

مولانا مخمور بڑی سادہ طبیعت کے مالک تھے انہیں شہرت سے کوئی سروکار نہیں تھا یہی وجہ تھی کہ ساری عمر آپ نے کوئی کتاب نہ چھپوائی انہیں شہرت کی تمنا ہی نہ تھی اور ایک سچے فنکار کو ہونا بھی ایسا ہی چاہیے اللہ تعالیٰ نے انہیں بے شمار صلاحیتوں سے نوازا تھا اُن کی پوری عمر علم وادب کی ترویج میں گزری انہوں نے رباعی اور مرثیے کو جو منفرد رنگ دیا آج کے شاعر اُن کی تقلید کرتے نظر آتے ہیں بھیرہ کی سرزمین اپنی کوکھ سے پیدا ہونے والے اس نامور سپوت کو ہمیشہ یاد رکھے گی اور اس پر فخر کرتی رہے گی آپ نے بھیرہ میں علم وادب کو فروغ دیا اور بزمِ مخمور کے نام سے ایک بزم بھی بنائی پاکستان میں آپ کے بے شمار شاگردان موجود ہیں جن میں ملک جعفر طیار کا نام سرِ فہرست ہے جو کہ ملکی سطح پر اپنے فن کا لوہا منوا رہا ہے اور اپنے مرحوم اُستاد مولانا مخمور کا نام روشن کر رہا ہے علم وادب کا یہ خزینہ ۱۹۸۰ء میں ۷۴ سال کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملا اور پھر علم وادب کا آفتاب منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا گیا اُنہیں بھیرہ کے مقامی قبرستان میں دفن کیا گیا خدائے برتر، مولانا مخمور مرحوم کے درجات بلند کرے۔ اور دنیا میں جس طرح وہ مہمان نواز اور دوست نواز تھے، خلد بریں میں اُن کی اسی طرح کی قیام پزیری عطا ہو۔۔ آمین ثم آمین

بے وفا کون

امین کنجاہی

07 جون 1947ء کو قائد اعظم محمد علی جناح نے تقسیم ہند کا فارمولا منظور کرتے ہوئے، باقاعدہ طور پر برصغیر کو تقسیم کرنے کا اعلان کر دیا، اور ریڈ کلف ایوارڈ مان لیا، جب یہ اعلان ہوا، تو جو لوگ مسلم ہندوستان میں آباد تھے، اُن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، اور ان لوگوں نے جو کہ وہاں پر آباد تھے جن کے آباؤ اجداد کی قبریں تھیں، اُن میں سے اکثر نے بھارت سے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کر دیا، اِن لوگوں کے خیال میں بلکہ ان لوگوں کو یقین تھا، کہ ہم لوگ جب پاکستان میں داخل ہوں گے، تو ایک جنت کی طرح کا منظر ہوگا، ہر طرف آرام ہوگا، خوشحالی ہوگی، اور ہم لوگ غلامی سے آزاد ہو جائیں گے، اِنھیں میں سے ایک گھرانہ ممتاز علوی کا بھی تھا، ممتاز علوی کے والد وکیل تھے، اور وہ جلندھر میں دیوی، طالب مندر کے نزدیک Reru کے محلے میں رہتے تھے اور بڑی خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے، ممتاز علوی اور اُس کے گھرانے میں جلندھر سے لاہور ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا، اُن سب نے جب ہجرت شروع ہوئی تو ہجرت دونوں طرف سے شروع ہوئی تھی، اِدھر کے ہندو دہلی، امرت سر، گرداس پور، جلندھر، بھگواڑا، لودھیانہ اور فروز پور، جانے کے لئے بے چین تھے، جب کہ انڈین مسلم جو تھے، وہ زیادہ تر لاہور جانا چاہتے تھے، اور اُن کا مین مقصد یہی تھا کہ وہ خیریت سے لاہور پہنچ جائیں، مگر جب تقسیم ہند کا اعلان ہوا، تو خاص طور پر مشرقی پنجاب میں قتل و غارت گری شروع ہوگئی، اور ہندوؤں کے اکسانے پر سکھوں نے کرپانے نکال لی، اور بے گناہ مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا، اُن کی ماؤں بیٹیوں کی عزت لوٹنے لگ پڑے، جو مہاجروں کی ٹرینیں دہلی سے آتیں، لاہور جانے کے لئے، اُنھیں راستے میں ہی لوٹ لیا جاتا، مسلمانوں کو قتل کیا جاتا، اُن کی جوان بیٹیوں کو اغواہ کر لیا جاتا، اور یہی سلسلہ مغربی پنجاب میں بھی شروع ہو چکا تھا، یہاں پر بھی مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کا قتل عام شروع کر دیا تھا، اور لوٹ مار بھی شروع کر دی تھی، مگر ایسے سخت اور خطر ناک حالات میں ممتاز علوی کے والد صاحب نے جو کہ حمید علوی ایڈوکیٹ کے نام سے جانے جاتے تھے، طے کیا کہ ہم بھی جلندھر سے لاہور کے لئے نکلتے ہیں، مگر حالت بڑے سنگین تھے، گلی محلوں میں جگہ جگہ لوٹ مار طور پھوڑ، اور قتل و غارت کا سلسلہ جاری تھا، مگر حمید ایڈوکیٹ صاحب نے اپنے محلے کے چند لوگوں کو جمع کیا، جو کہ Reru میں رہتے تھے، اور کچھ لوگ نور پور سے بھی شامل ہو گئے، اِن لوگوں نے ایک ٹرک کرائے پر لیا، اُس میں اپنا ضروری سامان رکھا، اپنے بچوں کو بٹھایا، خود بیٹھے اور چند محلے دار بی بیوں اور اُن کے گھر والوں کو ساتھ لیا، اور رات کے اندھیرے میں جلندھر سے امرت سر کی طرف، روانہ ہو گئے، جب یہ لوگ لودھیانہ سے نکل رہے تھے، تو اِن کا ایک پالتو کُتا، جرمن شیفرڈ جس کا نام ایڈوکیٹ حمید صاحب نے کلائیو رکھا ہوا تھا۔ اُس کو یہ لوگ جلندھر میں ہی اپنے محلے Reru میں چھوڑ دیا، اور جب ٹرک وہاں نے نکلا تو اِن کے پالتو کتے نے اُس ٹرک کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ اِس کتے کو ممتاز علوی نے بہت شوق سے پالا تھا، جب ممتاز نے دیکھا کے کُتا ٹرک کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا ہے، تو ممتاز نے اپنے ابا سے کہا ابا کُتے کو بھی ٹرک میں بیٹھا لیتے ہیں اِسے ساتھ لے چلتے ہیں، مگر حمید ایڈوکیٹ نے بڑے غصے میں کہا نہیں ممتاز، اپنی جان بچاؤ تمھے کتے کی پڑی ہے، مگر حمید کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو آ گئے، اور وہ سوچ میں پڑھ گیا، کہ کُتا تو وفادار جانور ہوتا ہے، اور وہ اپنی وفاداری کا ثبوت بھی دے رہا ہے، مگر میں جو کہ انسان ہوں اور اشرف المخلوقات میں سے ہوں، اس مشکل وقت میں اپنے وفادار کُتے کو ساتھ نہیں لے جا سکتا، ممتاز نے پھر ایک دفعہ کوشش کی ٹرک ڈرائیور کو آواز دی، کہ اُستاد جی ٹرک کو روکیئے گا کچھ سامان رہ گیا ہے ٹرک روکیئے گا، وہ لینا ہے مگر ممتاز کے بڑے بھائی نے اُسے ڈانٹ کے منع کیا، ہوش کرو ممتاز کیسی باتے کرتے ہو، اتنے میں ٹرک جو کہ کافی پرانے ماڈل کا تھا، شاید کہیں دوسری جنگ عظیم میں فوجیوں کے استعمال میں رہا تھا، جلندھر سے نکل کر کافی دور آگے آ چکا تھا، اور ممتاز کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو منڈلا رہے تھے، راستے میں کافی جگہ پر ٹرک کو روکا گیا، بلوائیوں نے ٹرک کو لوٹنے کی ایک دو دفعہ کوشش بھی کی، مگر ممتاز کے والد حمید صاحب جو کہ بہت عقلمند تھے، اُنھوں نے بڑی ہوشیاری سے بلوئیوں کو یہ باور کروا دیا، کہ ہم مسلمان نہیں ہم ہندو لوگ ہیں۔ اور ہم جلندھر سے امرت سر جا رہے ہیں، خدا خدا کر کے، یہ لوگ جلندھر سے امرت سر پہنچے، وہاں سے پھر یہ لوگ لاہور کے لئے روانہ ہو گئے، جب یہ لوگ لاہور کے بارڈر کے قریب پہنچے، تو ممتاز کو بہت تیز بخار ہو چکا تھا، اور اُس کی آنکھیں سُرخ تھیں، مگر اُس نے بات چیت کرنی چھوڑ دی تھی، ان لوگوں کو لاہور پہنچ کر والٹن کیمپ میں رکھ دیا گیا، وہاں پر بے شمار لوٹے پٹے خاندان رہائش پذیر تھے، جو کہ ہجرت سے پہلے اپنے گھروں میں باعزت زندگیاں گزار رہے تھے، خوشحال تھے، اور یہاں آ کر پاکستان میں جسے کہ ایک نعرے پر حاصل کیا گیا تھا، پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ، لے کر رہیں گے پاکستان، بن کے رہے گا پاکستان اور وہ پاکستان اب بن چکا تھا، ان مہاجر لوگوں کی مالی، جانی، اور اپنی ماؤں، بیٹیوں کی عزتوں کی قربانیاں دینے کے بعد یہ لوگ پریشان تھے، نہ ان کے پاس روٹی تھی، نہ چھت تھا، نہ کوئی کاروبار، اور حمید ایڈوکیٹ صاحب اور اُن کا خاندان جب جلندھر سے چلا تھا، تو بڑے پر عظم اور پر اُمید تھے، کہ ہم جلندھر سے امرت سر اور امرت سر سے جب واہگہ کا بارڈر پار کریں گے، تو ہم جنت میں ہوں گے، ان کے سارے خواب چکنا چور ہو چکے تھے، اور ممتاز ابھی تک اپنے وفادار کُتے کو، اپنے ٹرک کے ساتھ بھاگتا ہوا محسوس کر رہا تھا، اور اُس کو اِس واقع کا اتنا شدید ذہنی اثر ہوا تھا، کہ وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا، اور وہ بار بار ایک ہی بات دھراتا تھا، میں بے وفا، میں بے وفا، میں بے وفا، اور اُس کی آنکھوں میں کُتے کا چھڑا اُس کا بھوکنا، اور اُس کی بے بسی نے اُسے ذہنی توازن کھونے پر مجبُور کر دیا تھا، ممتاز کو پاکستان بننے کی قیمت یوں جھکانا پڑی کہ وہ والٹن کیمپ میں ممتاز پاگل کے نام سے جانا جانے لگا۔

سفید پرندہ- انتخاب وترجمہ از معین نظامی

انجم طاہرہ/ لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی

زیرِ نظر کتاب سفید پرندہ چند منتخب ایرانی لوک کہانیوں کا مجموعہ ہے اور یہ خوبصورت ترجمہ اور ترجمانی کی صورت میں پروفیسر ڈاکٹر معین نظامی صاحب کی ایک تازہ کاوش ہے۔ پروفیسر معین نظامی جہانِ ادبِ فارسی اور اردو کے نمایاں ادیب وشاعر اور برعظیم کی کلاسیکی اور خانقاہی روایات کے امین ہیں۔

سفید پرندہ ایران میں شائع ہونے والی لوک کہانیوں کے سولہ جلدوں پر مشتمل ایک منظم اور ضخیم سلسلہ ''فرہنگ افسانہ ھای مردمِ ایران (علی اشرف درویشیان ، رضا خندان مہابادی ، تہران، ۱۹۹۱۔ ۲۰۰۴ء) میں سے بائیس کہانیوں کا مجموعہ ہے۔اور بظاہر پاکستان میں یہ اپنی نوعیت کا تیسرا ترجمہ ہے۔ اس سے قبل پاکستان سے ایرانی افسانوں کے تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔جن میں قاضی بذل حق، ڈاکٹر اطہر مسعود، ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، بصیرہ عنبرین، اجمل کمال، ڈاکٹر شعیب احمد اور سفید پرندہ ہی کے مترجم ڈاکٹر معین نظامی صاحب کے نام نمایاں ہیں۔

اس کتاب کا عنوان سفید پرندہ عالمی منظر نامے پر خوف اور دہشت بھرے جس میں امن اور دوستی کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی طرح محسوس ہوا۔ اور اس نے گویا ایرانی لوک ادب کے سادہ، پرخلوص اور شکر بار ماحول سے جا ملایا۔

لوک کہانیوں میں ایک عجیب یک سوئی اور سکون کی کیفیت ہوتی ہے۔ کہانی اور انسان کے تعلق میں لکھاری اپنے تفکر کے سارے رنگ ، کرداروں کی موشگافیاں کبھی حقیقی اور کبھی افسانوی انجام دے کر اس کی نوک پلک سنوارتے ہوئے دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونے دیتا۔ کہانیوں کے کچھ کردار تمام عمر ہمیں ایک مخصوص دائرہ نفرت اور محبت، طبقاتی تقسیم، کچھ خاص منطقی وغیر منطقی نتائج کے حصار میں رکھتے ہیں۔ مثلاً کوئی درویش یا فقیر، نیکی پری، بوڑھی جادوگرنی، رحمدل بادشاہ وغیرہ۔ گویا ان کہانیوں کا انتخاب ہمارے شعور اور لاشعور میں چھپے جذبات وخواہشات کی تسکین کا ایک ذریعہ بھی ہے اسی بنا پر معاشرے میں ہم اچھے، برے، ظالم، رحمدل انسان بن کر سامنے آتے ہیں۔

سفید پرندہ کی کہانیاں امن کی پیامبر بھی ہیں اور اس کے کچھ کردار محبت اور رحم کی ترغیب اور ظلم اور نفرت سے بیزاری کے درس بھی دا کرتے ہیں۔ان میں سچائی اور خلوص کی خوشبو دکھائی دیتی ہے۔ جو شہری زندگی میں بہرحال ناپید ہے۔

سفید پرندہ میں کچھ عنوان ،محاورے یا اصطلاحات کتاب کی جان ہیں۔''انار اور مچھلی'' گویا حکم حاکم مرگ مفاجات اور ایک محکوم معاشرے کی تکلیف دہ تصویر کشی کرتی ہے۔''تیغ بہادر'' کی کہانی پڑھتے ہی شدت سے اس کا انتظار شروع ہوگیا کہ وہ آئے اور مہنگائی ،غربت اور کرپشن کے تعفن کا صفایا کرے۔اسی طرح ''خاں گردوغبار خاں'' گویا سیاسی بقا کے لئے مکر کا جواب مکر سے ہے۔ پاکستان کے حالیہ اور گذشتہ کچھ عرصے کے سیاسی پس منظر کے حوالے سے چند دلچسپ جملے: فیصلہ تو قاضی صاحب کا ہی چلتا ہے؛ سلطنت میں چاپلوس، مکار اور بھیڑیوں جیسے ظالم لوگ زیادہ ہو جائیں گے ؛ اب پریشان ہونیکی ضرورت نہیں سلنت میں عدل و انصاف کا احساس رکھنے والوں کی کثرت ہوگئی ہے۔(امید ہے وطن پاکستان ایسی روشن صبحیں لازم دیکھے گا)۔

ترجمہ نگاری خود ایک فن ہے جس کے دقیق اور کٹھن تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مترجم کا وسیع المطالعہ، باذوق اور تخلیقی صلاحیتوں کا مالک ہونا لازم ہے۔لوک کہانیوں کا ترجمہ افسانوی ادب یا کسی بھی دوسرے ادب کے تراجم سے نسبتاً مشکل کام ہے۔تا وقتیکہ وہ آسان پیرائے میں نہ لکھی گئی ہوں۔اس لحاظ سے سفید پرندہ کی کہانیوں کو پڑھ کر ترجمے کی گرانی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ قاری کا تجسس اور دلچسپی کہانی کے آخر تک برقرار رہتی ہے اور وہ سادہ، سلیس اور رواں الفاظ کی چاشنی کے سحر میں کھویا رہتا ہے۔

اس ترجمہ کے ذریعے ہم ایک مختلف یا مشترک تہذیب و ثقافت سے آشنا ہوتے ہیں ۔ اس کے ابتدائیہ میں مترجم نے نہایت خوبصورت اور موثر طریقے سے لوک کہانیوں کے ایک ماخذ اور گھرانے کی طرف اشارہ کیا ہے۔مختلف جغرافیائی ،معاشی اور معاشرتی اتار چڑھاو کی بنا پر کہانیاں مختلف خطوں میں تقسیم ہوتی گئیں لیکن ان کا خمیر مشترک ہونے کی بنا پر مسائل خیر وشر اور ان کا اظہار حیرت انگیز طور پر ایک سے لگتے ہیں۔ انہوں نے ایران کے معروف اور رجحان ساز مصنفین اور شعرا کا لوک کہانیوں کی تخلیق میں خصوصی فطری دلچسپی کے متعلق بھی نہایت اہم معلومات فراہم کی ہیں جو یقیناً پاکستان کے ادیبوں کے لئے اس عظیم خطے کے وسیع تہذیبی تشخص کی حفاظت اور عالمی سطح پر اس کی پہچان کے لئے پیغام تشویق وفکر ہے۔

ایران و پاکستان کی تہذیب کے ملاپ کے اس کڑے عمل سے وہی صحیح طور پر نپٹ سکتا ہے۔جس نے خود اپنی تہذیب کو بنتے ،سنورتے ، بگڑتے اور نوجوان نسل کو اس سے منہ پھیرتے دیکھا ہو۔ مجھے لگتا ہے جیسے محبت اور دعا کے رنگین دھاگوں کے شعروں بھرے دیسی تکیے پر پلکیں موندھے، موتیے اور پودینے کی خوشبو آنکھوں اور روح میں سموتے ، بیلوں کی گھنٹیوں کا گیت سنتے ، فطرت کے براہ راست شاگردوں اور ہمسایوں کے رسیلے چھتوں کی حلاوت اور تازگی کو چکھتے ، بے ریا شفاف پانی سے سچے میاں محمد حیات اور بخشونائی ، اللہ دتا موچی اور ماسی راجھی جیسے کرداروں کو ڈھونڈتا ،خوابوں کے یاقوت کے حجر میں

گرفتار، سلیمانی چرخے سے گرا ہوا، اجداد کی میراث کو نہایت احتیاط سے سنبھالتا، حقیقت کی دنیا میں اجنبی خانقاہ شناس۔ معین نظامی۔ اپنی جائے پناہ ان ہی لوک کہانیوں میں ڈھونڈتا ہے۔ ان کی اپنی تحریروں میں پنجاب کے بہشتی رس والے کنو، گنے، شکر بار گائیں، سایہ دار برگد، آم، شیشم اور کڑوے تمبا کو سی خالص ثقافت اپنے بھرپور جوبن پر دکھائی دیتی ہے۔ اور وہ اپنے تخیل کی جادوئی چھڑی سے چھو کر درویشانہ روایتوں والے محبت اور شفقت بھرے برآمدے اور دالان، ان میں بیٹھے اپنے وجود اور اصل کے سب رشتوں کو بھولے بسرے اور متروک الفاظ سمیت لہجوں کی نرمی، شائستگی اور مروت کے ہمراہ چیت، بیساکھ اور ساون کے مہینوں میں واپس لانا چاہتے ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ آج ہم کہانی پڑھنے سے کیوں محروم ہیں یا اس کو محض بچوں کا ادب کہہ کر محدود کر چکے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر معین نظامی صاحب کا شکریہ کہ انہوں نے اس ترجمہ کے ذریعے ایرانی لوک ادب کی شیرینی میں اپنے لوک ادب کی مٹھاس ملانے میں مدد دی اور یہ احساس دلایا کہ ہمیں بھی اس مٹی اور اس کی لوک کہانیوں کو منظم و مرتب کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	-/140 روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتبہ: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	-/350 روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	-/200 روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	-/200 روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	-/700 روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	-/150 روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	-/700 روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	-/800 روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	-/200 روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	-/400 روپے
تنقیدات حسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	-/300 روپے
تحقیقی شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	-/500 روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	-/250 روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	-/500 روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/250 روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	-/250 روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	-/400 روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	-/200 روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیر ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ اٹھارہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے

اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

حال کا سلطان

حرا بتول/ راولپنڈی

تاریخ کے دو درخشاں ستاروں حیدر علی اور سلطان ٹیپو سے کون آگاہ نہیں۔ باضمیر اور جفاکش درد دل رکھنے والے وطن پرستوں کے ذہنوں پر آج بھی ان کے نام نقش ہیں یہاں تک کہ بچہ بچہ بھی ان کے ناموں سے واقف ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا میسور کے سلطان کی بین الاسلامی اتحاد کی کوشش فقط جغرافیائی حدود کا تحفظ اور حکومت کا حصول تھا؟ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ وہ مسلم ریاستوں الغرض مسلم قوتوں کے اتحاد کا حامی تھا کہ کسی طرح یہ اتحاد قائم رہے اور کوئی مخالف قوت برسر اقتدار آ کر ان کے حقوق پامال نہ کرے ان پر مسلط ہو کر مسلم تہذیب کو نقصان نہ پہنچائے۔ اگر ایسا ہوا تم مسلمان غلام قوم بن جائے گی اور اسلامی اقدار کا نفاذ ممکن نہ ہوگا۔ دوسری قومیں ان پر سبقت لے جائیں گی اور ان کو اسلام کی مرکزیت سے جدا کر دیں گی۔ مگر مسلمانوں کی باہم نااتفاقی ذاتی اغراض و مقاصد اور حرص کے باعث یہ ممکن نہ ہو سکا بلکہ مسلم حکمران اور ریاستیں بذات خود مغرب کے لیے فتح یابی کا سبب بنیں۔ یوں سمجھ لیں کہ جیسے چور گھر میں داخل ہوں اور سوال کریں کہ قیمتی سامان کہاں ہے اور جواب میں گھر کا ہی کوئی فرد اٹھ کھڑا ہو اور قیمتی اشیاء کا پتا دے دے۔

آج بھی ہم اسی نہج پر کھڑے ہیں بات تنقید کرنے اور مایوس ہونے کی نہیں ہے بلکہ رویوں پر نظر دوڑانے کی ہے۔ آج بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ مسلم قوتیں ایک دوسرے سے ناراض لاتعلق یا بے خبر دکھائی دیتی ہیں اور اس کی مختلف وجوہات بتائی جاتی ہیں اور دلائل بھی دیے جاتے ہیں الغرض اسلامی حیثیت کو وطن کے نام پر قربان کر دیا جاتا ہے یعنی ایسی وطن پرستی جو دین سے جدا ہے اور اس میں کسی اور خطے میں رہنے والے مسلمان کی جان و مال اور ابرو کی حفاظت کی ذمہ داری نہیں لی جاتی اور فقط اپنے خطے کے مسلمانوں کے حقوق کی پروا کی جاتی ہے۔ وطن پرستی بری چیز نہیں مگر کیا یہ اسلام سے افضل ہے؟ اسلام ہی تو وطن کی خوشحالی کا ضامن ہے اسی سے ہی تو اس کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں اسی سے ہی بین الاسلامی اتحاد فروغ پاتا ہے تو پھر کیسے کسی معاشی، جغرافیائی یا سیاسی دلیل کو مان کر خاموشی اختیار کی جائے۔ یاد رہے یہ وہی خاموشی ہوگی جس کا سامنا ٹیپو سلطان کو کرنا پڑا، بس اس کا رنگ اور اظہار مختلف ہوگا یہ کسی طرح سے کارآمد نہیں بلکہ تشویشناک ہے جس سے انفرادی تشخص بھی بالآخر ایک دن مٹ جاتا ہے اور پھر نہ وطن رہتا ہے، نہ سیاست، نہ اقتدار، نہ معیشت، نہ حکومت، نہ اخلاقی قدریں نہ مذہب کی پاسداری نہ قوم کی خودداری یعنی کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ اس لیے بین الاقوامی سطح پر قوموں کے اتحاد کی اشد ضرورت ہے اور ہر مسلم مملکت کی ذمہ داری ہر کہ دنیا کے کسی بھی خطے میں بسنے والے مسلمانوں کے حقوق کے لیے ضرور آواز اٹھائے اور ان پر ہونے والے ظلم و ستم کے خلاف ان کی آواز بنے۔ ان کے درد کو محسوس کرے اور ظلم کے خلاف کبھی خاموش یا لاتعلق نہ ہو۔ آج کے دور کا سلطان وہ ہے جو حق کا پرچار کرے بین الاقوامی سطح پر اتحاد کو فروغ دے اور امت کو جوڑنے میں اپنا عملی کردار ادا کرے اس کے سامنے سب سے مقدم امت مسلمہ ہو نہ کہ ذاتی اغراض و مقاصد یا مجبوریاں۔۔۔ اس کے جذبے کو کوئی طاقت یا دلیل پست نہیں کرتی۔ وہ چٹان کی طرح مخالف قوتوں کا مقابلہ کرتا ہے اور اسلام کو وطنیت پر مقدم سمجھتا ہے اور دنیا کے ہر خطے میں بسنے والے مسلمانوں کو ایک ہی ریاست سمجھتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ سلطان کوئی حکومتی نمائندہ یا صاحب اقتدار فرد ہو بلکہ اس میں ملت کا ہر ایک فرد پیش پیش ہے جو اپنے رویے سے اور اپنی آواز سے امن اور محبت کا پیغام پوری امت تک پہنچاتا ہے اور کسی بھی تعصب کا شکار نہیں ہوتا وہ کبھی لسانی جغرافیائی ثقافتی اور معاشی بنیادوں پر بین الاسلامی نفاق کا خواہاں نہیں ہوتا بلکہ ان سب سے ماوراء اسلامی اتحاد کا خواہش مند ہوتا ہے۔ سازش کا شکار ہو کر خود کو ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کرتا بلکہ وہ فقط مسلمان ہوتا ہے اور ہر علاقے، رنگ، نسل اور قوم سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کا ہمدرد اور محافظ ہوتا ہے۔ اس لیے انفرادی و اجتماعی سطح پر اس فکر کو عام کرنے کی اشد ضرورت ہے اور ایسے اتحاد کی ضرورت ہے جو مسلم قوتوں کو ایک لڑی میں پرو دے اور اگر ایسا نہ ہوا تو اس کی قیمت تمام مسلم امہ نہ جانے کب تک ادا کرتی رہے گی اور مخالف قوتیں ان کو اپنی اغراض و مقاصد کے لیے استعمال کرتی رہیں گی اور میسور کی طرح ہمیشہ مسلمانوں کو محصور کر دیں گی اور پھر کوئی سلطان مرد مجاہد تنہا میدان میں لڑ رہا ہوگا۔۔۔۔

خدا تجھے کسی مہماں سے آشنا کردے

پروفیسر نور کمال شاہ/ بونیر

اب تک کی تحقیق کے مطابق اچھے بھلے انسان کے ذہنی اور اخلاقی سکون وثبات کو تباہ و برباد کرنے میں جو حلقے براہ راست ملوث رہے ہیں ان میں دیگر کئی طبقوں کے ساتھ مہمان بھی شامل ہیں- اگر چہ یہ ذمہ داری کلیتا" بیگم، بینگن اور بچوں کے سر تھوپی جاتی ہے مگر اس سلسلے میں مہمانوں کا کردار کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا- مہمان نہ صرف آپ کی نجی زندگی بلکہ ساتھ ساتھ خانگی زندگی کو بھی بے سکون بنانے کا ہنر جانتے ہیں- ہاں! اگر وہ مہمان ہونے کے دعوے کے ساتھ قرض مانگنے کے دعوے دار بھی ہوں اور آپ کی اقتصادی حالت پہلے سے بیٹھی بلکہ لیٹی ہوئی نہ ہو؛ یعنی آپ اس پوزیشن میں ہوں کہ آپ کی مالی حالت مزید خراب کی جاسکے، تب خدشہ ہے کہ مالیاتی سکون بھی غارت ہو جائے گا- بیگم اور بچوں کو تو بہر حال اس فہرست سے خارج سمجھا جاتا ہے کہ وہ قانونی، اخلاقی اور شرعی طور پر اس کے مجاز ہوتے ہیں کہ آپ کا سکون لوٹ سکیں؛

ان کا حق ہے کہ جسے چاہیں اسے خوار کریں

اور باوجود مجرم اور محرم ہونے کے، ان سے سمجھوتا کرنا اور ان ہی کے سانچے میں خود کو ڈھالنا وقت اور حالات کا تقاضا ہوتا ہے اور ہمیں مجبورا" نہ چاہتے ہوئے بھی ایسا کرنا پڑتا ہے کیوں کہ شادی کے بعد شوہر نامدار کا اولین فرض یہی ہوتا ہے (اور بقا کا واحد راستہ بھی) کہ وہ جلد از جلد بیگم کے تیار کردہ سانچے میں فٹ ہو جائے، مگر مہمانوں کے جرم کو کسی طور بھی معاف نہیں کیا جاسکتا-

مہماں بننے کے لئے فاصلے کی شرط اس کے مقام و مرتبے کا تعین کرتی ہے- زیادہ دور اور لمبے فاصلے سے آیا ہوا مہماں زیادہ قابل توجہ اور زیادہ قابل احترام سمجھا جاتا ہے- آج کل سائنس کی برق رفتار ترقی کے آگے ہماری اپنی اخلاقی ترقی صفر ہو کر رہ گئی ہے- چند دہائیاں پہلے مہماں کا جو مقام اور مرتبہ ہوا کرتا تھا، آج کی تہذیب یافتہ معاشرے میں وہ معدوم ہو چکا ہے- اس زمانے میں کوئی بھی نو وارد جو کہیں باہر سے آیا ہوا ہوتا؛ آبادی کے اندر پہنچ کر وہ مہمان کے مرتبے پر فائز کیا جاتا - سب محلے والے اس کی آو بھگت کرتے اور حسب توفیق اس کی ضروریات کا خیال رکھتے - گاوں کے بڑے حجرے میں اس غرض سے انتظام موجود ہوتا- مہمان کے لئے بستر اور کھانے پینے کا فورا" ہی بندوبست ہو جاتا اور رات کو اسے آرام سے سلا دیا جاتا؛

جا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سو جا

مگر روز افزوں ترقی سے یہ روایت اب دم توڑ چکی ہے - رہی سہی کسر ہوٹل مالکان اور ریسٹورنٹ والوں نے پوری کردی ہے کہ وہاں بستر اور کھانے پینے کی ضرورت بآسانی پوری ہو جاتی ہے- اب کوئی بھی شہر یا بازار کے چوراہے پر کسی گاڑی یا کھوکھے کے پیچھے پناہ لے کر خود کو مہمان کی عقابی نظروں سے بچا سکتا ہے اور بدقسمتی سے سامنا ہو بھی جائے تو شدید مصروفیت کا بہانہ کر کے اسے ہوٹل کی چائے پر آسانی سے ٹرخایا جاسکتا ہے- اس لحاظ سے قبل از ترقی دور کو مہمانوں کا دور کہا جاسکتا ہے- یہ وہ دور تھا جب مہماں سکون لوٹنے کا سبب نہیں سمجھے جاتے تھے بلکہ ان کو تحفہ خداوندی اور اللہ کی رحمت سمجھا جاتا تھا- مہمان خواہ ذاتی ہوتا خواہ اجتماعی؛ اس کی آمد پر ایک گونہ خوشی اور مسرت کا اظہار ہوتا؛ اور اسے کشادہ پیشانی کے ساتھ خوش آمدید کہا جاتا؛

چلے بھی آو کہ گلشن کا کاروبار چلے.....

پھر بھی اگر کوئی اس رحمت کو اپنے لئے زحمت محسوس کرتا تو بڑی آسانی سے خود کو بچا سکتا تھا- جیسے کسی گاوں میں ایک شخص کھانے کے بعد حجرے پہنچا تو وہاں مہماں موجود تھا- اور کوئی مقامی فرد وہاں نہ تھا- علیک سلیک کے بعد اس نے روایتا" مہماں سے پوچھ ہی لیا کہ ہاں بھئی مہمان! کیا تم نے کھانا کھالیا ہے؟- مہمان بے چارہ تو بھوکا تھا، فورا" بولا: نہیں جی! میں نے کھانا نہیں کھایا ابھی- وہ شخص حاضر جوابی سے بولا: اچھا----!! شکر ہے میں نے تو کھالیا ہے..... !!!

ان مہمانوں کے حال اور چال (واپسی میں) پر بندے کے دل کے ہزار ٹکڑے ہو جاتے ہیں جو بڑی بڑی خود ساختہ توقعات لے کر آتے ہیں مگر خالی کاسہ لے کر مایوس لوٹ جاتے ہیں- چند مہینے پہلے ایسا ہی ایک قرض اور غرض کا مارا مہمان میرے ہاں پہنچا اور باقاعدہ تمہید باندھ کر اپنی غمخواری اور تہی دامنی کی داستان سنا کر مجھے آبدیدہ بنانے کی کوشش کرنے لگا- ظالم میری تنخواہ اور ماہانہ خرچ کا باقاعدہ چارٹ بنا کر لایا تھا- مجھے سمجھانے لگا کہ دو سال پہلے ترقی ملنے کے بعد آپ کی تنخواہ تھوڑی سی کمی بیشی کو ملا کے ایک لاکھ روپے تک تو ہوگی- آپ کے سودا سلف کا خرچ اور دیگر گھریلو اخراجات تقریبا" تیس ہزار روپے تک ہوں گے کیوں کہ آپ تو ویسے بھی چکنائی کم کھاتے ہیں، میٹھے سے پرہیز بھی کرتے ہیں، ڈاکٹر نے گوشت کھانے سے بھی منع کیا ہے اور فضول خرچ بھی نہیں ہیں- بچوں کے تعلیم کے خرچے دس پندرہ ہزار ہوں گے یا چلیئے بیس ہزار ہی لگالیں- اس حساب سے آپ کے پاس پچاس ہزار روپے فی مہینہ زائد بنتے ہیں جسے بچت کے پلڑے میں ڈالا جاسکتا ہے- چنانچہ ایک سال میں آپ کم از کم چھ لاکھ کے مالک بن چکے ہیں

اور میری ضرورت فقط تین لاکھ ہے، سو دے دیجئے گا- حیران رہ گیا - وہ بندۂ خدا اپنی ترازو میں مجھے تول گیا تھا - اپنی آمدن اور خرچ کا لمبا چوڑا حساب سمجھا کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی اور بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا - ہاں البتہ ہمیں سو فیصد امید تھی کہ وہ ہماری بات کا یقین کبھی نہیں کرے گا - ایسا ہی ہوا - اس نے میری وضاحتوں سے اتفاق نہ کیا ؛ اپنی ناراضگی کے ثبوت کے طور پر وہ ہاتھ ملائے بغیر رخصت ہو گیا حالانکہ آتے وقت اس نے نہ صرف بڑی گرمجوشی سے ہم سے ہاتھ ملایا تھا بلکہ عقیدت کے اظہار کے طور پر میرے ہاتھوں کو چوما بھی تھا-

پشتو میں ایک ضرب المثل مشہور ہے " کہ دا بئ خپل ئی نو کور تہ رازہ آو کہ دوادا خپل ئی نو بہر کینہ "- اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کے عزیز ہو تو گھر کے اندر آجاو اور اگر بابا کے رشتہ دار ہو تو باہر ٹھہر جاو-

اگر آپ نے اب تک کے مضمون کو بحالت ہوش و حواس پڑھا ہے تو اتنی سی بات تو آپ کے ذہن میں آ چکی ہوگی کہ اس جنس گرانمایہ کو بلحاظ حیثیت دو درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ؛ اولاً" گھر کے مہمان اور دوم باہر کے مہماں - ان دونوں میں سے خطرناک ترین اور مضر سکون و سکوت پہلی والی قسم ہے- یہ نہ صرف آپ کے آرام و اطمینان بلکہ خاموشی و سکوت کی بھی قاتل ہے- ان کے گھر میں تشریف لاتے ہی آپ کو سکون اور خاموشی کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں ہوگا -تعجب کی بات یہ ہے کہ مضر ہونے اور سمجھے جانے کے باوجود ان کا مقام و مرتبہ دوسرے قسم کے مہمان سے افضل ہوتا ہے -ان افضل مہمانوں کا سرا اگر بدقسمتی سے بیگم کے میکے شریف سے جا ملتا ہو پھر تو کیا کہنے - آپ کی پوری ملکیت و جاگیر یعنی بھرا پرا گھر ان کے قبضے میں چلا جاتا ہے- یہی وہ موقع ہوتا ہے جب آپ اپنے ہی گھر میں غیر اور اجنبی بن جاتے ہیں - توجہ اور التفات کے سارے گلدستے مہمانوں پر نچھاور کئے جاتے ہیں - آپ کے استعمال کے تمام ذاتی و غیر ذاتی ؛ اہم، قیمتی اشیاء ان کے تصرف میں آجاتی ہیں - بے بسی اور لاچارگی کی تصویر بن کر اپنی قیمتی چیزوں کا حشر دیکھتے ہوئے بھی آپ کچھ نہیں کر پاتے -

پچھلے مہینے کچھ خاص مہمان ہمارے ہاں تشریف لائے - بیگم صاحبہ کا بھائی اپنی چہیتی بیگم اور چار نٹ کھٹ شریر بچوں سمیت ہمارے مہمان بنے - یہ لوگ چونکہ دور کے شہر میں رہتے ہیں اس لئے ان کا دورہ کوئی خفیہ دورہ نہیں تھا بلکہ پہلے سے طے شدہ ٹائم فریم کے عین مطابق تھا - ان کو پانچ دن ٹھہرنا تھا ہمارے گھر- آپ یقین کریں شرارت کا اصل مفہوم ان بچوں کو دیکھ کر میری سمجھ میں آیا - اس سے پہلے شرارت کا جو مطلب میں سمجھتا تھا ان لوگوں نے اسے بالکل ہی غلط ثابت کیا - ان بچوں کے حرکات و سکنات اور کارنامے دیکھ کر میں تو دنگ ہی رہ گیا - اتنے بگڑے اور خود سر بچے میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھے تھے - گھر میں گویا ہنگامی حالت نافذ ہو گئی - پہلے ہی دن ان بچوں نے دھکا دے کر میرے چھوٹے بیٹے کو گھر کی سیڑھیوں سے گرا دیا - بچے کے سر اور چہرے پر چوٹیں آئیں تھیں - بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑا - دوسرے دن ایک بچے نے دوسرے کے سر کو شیشے کے گلاس سے نشانہ بنا کر ہٹ کرنے کی ناکام کوشش کی - سر تو محفوظ رہا مگر گلاس کے زد میں آنے والے کھڑکی کے دو شیشے چکنا چور ہو گئے - اسی دن دو بچوں میں صحن کی کیاریوں میں لگے پھولوں کو توڑنے کا مقابلہ شروع ہوا اور تیسرا چھوٹا بچہ ماں کی گود میں بیٹھا اس کے سر کے بال نوچتا ہوا احتجاج کرنے لگا کہ پھول توڑنے میں اسے کیوں شریک نہیں کیا جا رہا - مجبوراً اس کی ماں کو اٹھ کر اس کے لئے پھول توڑنا پڑا - ساتھ ہی فخریہ انداز میں بیٹے کی پسند کی داد دیتی ہوئی فرمانے لگی :

ہائے ؛! میں صدقے جاوں، میرے گڈو کو پھول کتنے پسند ہیں!!

غالباً" چوتھے دن کا ذکر ہے- کالج سے واپسی پر جیسے ہی میں گیٹ کے اندر داخل ہوا ، کوئی چیز اڑتی ہوئی آ کر میرے ماتھے پر لگی - ماتھے کو سہلانے کے بعد دیکھا کہ کاغذی جہاز کے ذریعے مجھے نشانہ بنانے کی بھونڈی کوشش کی گئی تھی - ماتھا تو میں نے اس وقت پیٹا جب کاغذ کھول کر دیکھا - رات کو میرے تازہ ترین لکھے افسانے کا خاکہ تھا جسے جہاز کے خام مال کے طور پر استعمال کیا گیا تھا - آگے جا کر دیکھا کہ موصوف کا دوسرا بھائی کاغذی کشتی بنا کر اسے نالی کے پانی میں بہانے کی کوششوں میں مصروف تھا - کشتی ان سے چھین کر کانپتے ہاتھوں سے گیلے کاغذ کو کھولا - ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے - پرنسپل صاحب کی طرف سے حوالہ شدہ اہم نوٹیفکیشن کو ان ظالموں نے کشتی بنا کر بہا دیا تھا-

ان پانچ دنوں میں ہمارے گھر میں قیمتی برتنوں کا جتنا قتل عام ہوا وہ تاریخ میں لکھے جانے کے قابل ہے- دیواروں پر نادر فرمودات تحریر ہوئے ؛ مارکروں سے گھر کے سفید دیواروں اور دروازوں کو منقش بنانے کی منظم کوششیں کی گئیں ؛ واش روم کے فلش میں کاغذ اور پلاسٹک کے تھیلے ڈال کر اسے بند کرنے کی مہم چلائی گئی-

جاتے جاتے سالے صاحب نے میری مختصر سی لائبریری سے پانچ ضخیم کتابیں منتخب کر کے نکالیں اور بڑے پیار سے گویا ہوئے ؛ بھائی جان! یہ کتابیں میں ساتھ لے جاتا ہوں، آپ تو ویسے بھی اسے کئی بار پڑھ چکے ہوں گے "- زرد چہرے پہ زبردستی کی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا ؛" ہاں ہاں! کیوں نہیں ; آپ ہی کی تو ہیں سب" - اس سے پہلے ہی ان کا ایک بچہ میرے بیٹے کی نئی سائیکل گھر لے جانے کے لئے منتخب کر چکا

شاعری

عشق کے باغ میں کیسی ہے یہ شاعر کی تقدیر
ہاتھ پڑے پھولوں کے حلقے پاؤں پڑی زنجیر
اس کے آزادی کے شوق سے دشمن کو ہے مات
موت نے کتنے بھاگ ہیں کھیلے زندہ ہے کشمیر
درد بھرا ماحول ہے کتنا گیت ہوئے بے لطف
کڑوا ہر اظہار ہوا ہے پھیکی ہر تقریر
اک دن ذائقہ غالب کر دے شیرینی سے ذوق
اک دن آزادی کے میٹھے شعر پڑھے گا میر
اس کے جذبے اس کے غم ہر بازی لیں گے جیت
ایک مثالی دیس بنے گا دنیا میں کشمیر

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

خطا کاری کی گرفت

کوئی جب آپ کو اپنی مہارت سے
خطا کاری میں اُلجھا دے
تو اس چنگل سے آزادی بڑی مشکل سے ملتی ہے
یہی بہتر ہے اس اُلجھن کے
پہلے ہی مراحل میں
مسائل کو نظر انداز کرنے کا چلن چھوڑیں
فراست کی روش پر گامزن ہو کر
ہمہ وقتی توجہ سے
خطا کاری سے بچ نکلیں
وگرنہ بعد میں تو بے بسی کی رسیاں ہوں گی
کہ بے دردی سے جو پھر آپ کو فوراً جکڑ لیں گی
گرفت ان کی مسلسل بڑھتی جائے گی
رہائی پھر کہاں ہو گی

پھر اس کے بعد کی ساری تگ و دو اضطراری ہے
فقط خواری ہی خواری ہے

ممتاز راشد لاہوری/لاہور

میری سوچیں نہ دباؤ میں ابھی زندہ ہوں
مجھ سے دامن نہ چھڑاؤ میں ابھی زندہ ہوں
سانس چلتی ہے ابھی ہار نہیں مانی میں نے
میرے دشمن کو بتاؤ میں ابھی زندہ ہوں
یار میرے جو مجھے مار چکے ہیں کب کے
یہ غزل ان کو سناؤ میں ابھی زندہ ہوں
یہ خیالات ، کمالات سبھی درد کے ہیں
زخم اک اور لگاؤ میں ابھی زندہ ہوں
ربِ کامل کی عطا سے ہے سخن ساگر کا

.....

شب گزاری کہ رتجگے میں تھا
یاد کے ایک سلسلے میں تھا
کھو گیا پھر وجود بھی اپنا
میں کسی اور آئینے میں تھا
چاند بھی ہاتھ میں اتر آیا
یہ ہنر ایک معجزے میں تھا
شہرِ یاراں میں اجنبی رہنا
میری قسمت کے حادثے میں تھا
ہم نے دیکھا کہیں نہیں ساگر
جو سکوں شب کو جھونپڑے میں تھا

ندیم اظہر ساگر/لاہور

بعد از ترا خرابیٔ بسیار پوچھنا
توبہ ہے تیرا حالتِ بیمار پوچھنا
کیا مجھ سے بڑھ کے حور و پری دلفریب ہیں
نظریں ملا کے یوں تیرا ہر بار پوچھنا
آنکھوں سے میری روز ہی کرتے سوال ہو
مجھ دل کو بھی ذرا مری سرکار پوچھنا
دنیا کے لوگ کرتے پھریں کاخ و کو کی بات
پر رسمِ عاشقی نہیں گھر بار پوچھنا
میرا ابھی تو ہے کہ عدو کا ہوا ہے تو
یہ جانتا ہوں جائے گا بے کار پوچھنا
تجھ سے خدا کی ہو جو ملاقات واعظا!
کیوں اس قدر ہے ظلم کی بھرمار پوچھنا
آواز کون بخشے ہے انجم پرند کو
کوئل نے سیکھی کس سے ہے گفتار پوچھنا

.....

ایسے ویسے آ جاتے ہیں
باتیں چار سنا جاتے ہیں
جن کو الف نہیں ہے آتا
بے تک وہ سمجھا جاتے ہیں
دیکھ کے اپنے دائیں بائیں
پوری غزل سنا جاتے ہیں
جو لفظوں کے جادوگر ہیں
اپنا کام دکھا جاتے ہیں

خادم علی انجم/لاہور

محبت کے سبھی پھولوں کا پتھر سے جواب آیا
سمندر جس کو سمجھے تھے وہ بن کر اک حباب آیا
ملی فرصت جو اوروں سے خیال اس کو شتاب آیا
جوانی میں لکھے تھے خط ، بڑھاپے میں جواب آیا
کسی نے خاص مقصد سے اتارا یوں ہے شیشے میں
کہ سوچوں پر پڑے تالے ، خیالوں پر حجاب آیا

عجب قسمت کا مالک ہے، ستا کر دل کی دنیا کو
نہیں ٹوٹا وہ اندر سے، نہیں زیرِ عتاب آیا
کسی بے چین جذبے نے پکارا جب بھی شدت سے
حقیقت بن کے منظر پر ہمیشہ سے سراب آیا
پسِ چلمن اشاروں کا زمانہ اب کہاں بسملؔ
نئی دنیا محبت کی نیا اس میں نصاب آیا

عبدالوحید بسملؔ/ایبٹ آباد

وہ جو دیکھا تھا کہیں، یاد نہیں
آسماں تھا کہ زمیں، یاد نہیں
ڈھیر ہیں راکھ کے چاروں جانب
بستیاں کیسے جلیں، یاد نہیں
عہد و پیماں کی اُچھلتی لہریں
کس سمندر میں گئیں، یاد نہیں
گیت ہی گیت تھے یا رنگ ہی رنگ
ہم مکاں تھے کہ مکیں، یاد نہیں
تیرہ بختی سے رہا جس نے کیا
اب وہ مہتاب جبیں، یاد نہیں
وہ حسیں صبحیں، وہ نشیلی شامیں
ہم سے کیوں روٹھ گئیں یاد نہیں
کیوں بنا ہجر مقدر شاقیؔ
کیا ہوا خواب حسیں، یاد نہیں

عقیل شاقیؔ/لاہور

جو پایا خود کو تمہارے خیال میں دیکھا
جو دیکھا دل کو تمہارے وصال میں دیکھا
کسی کا حُسن کسی بے مثال میں دیکھا
اسی لیے تو ہمیشہ کمال میں دیکھا
بکھیر دی مری شوخی نے اُن لبوں پہ ہنسی
اُداس حُسن کو جب بھی ملال میں دیکھا
وطن کی کشتی جو دیکھی بھنور میں دیکھی سدا
جو ناخدا تھے ہمیشہ سوال میں دیکھا
ہر اک گناہ گھڑی بھر کا، لمحے کی لذت
بھٹک گیا جو بھی انساں وبال میں دیکھا
جدید دور کا تحفہ بنامِ جدت ہے
ہر ایک لمحۂ انساں زوال میں دیکھا
وہ پارسا، نہیں اپنے گناہوں کا ادراک
گناہ گار وہ جن کو وصال میں دیکھا
ڈھلا ہے حُسنِ قیامت وہ سانچے میں مسعودؔ
جمالِ حُسن ہمیشہ جلال میں دیکھا

خالد مسعودؔ/لاہور

نہ رزق بند ہوگا گناہوں کے داغ میں
غالب ہے رحم نورِ ازل کے چراغ میں
دل پہ ہیں اپنے داغِ ندامت لیے ہوئے
آئے ہیں آج ہم تری رحمت کے باغ میں
عالم وہ بے خودی کا تو پھر دیکھا چاہیے
دل جلوہ ساقی مانگے، نہ مئے اب ایاغ میں
توڑیں گُلِ شگفتہ کبھی پکڑیں تتلیاں
سرمستیوں کے ڈیرے لگے آج باغ میں
سچ مچ ہے قدردان بہت ذاتِ ذوالجلال
ہو آہ میں اثر تو تڑپ کچھ ہو کاغ میں
مسعودؔ زمزمے بھی ہیں کیا رنگ و لاگ کے
فطرت کے نغمے پنہاں ہیں کچھ خاص، زاغ میں
سب حق شناس بات یہ مسعودؔ کہہ گئے
بچ جائیں کاش گرنے سے بچ جائیں کاغ میں

خالد مسعودؔ/لاہور

پھولوں کا ہے قصور نہ خاروں کی بات ہے
یہ دل کی رہگذر پہ خساروں کی بات ہے
تو ہے مکین روشنی تجھ کو بتائیں کیا
یہ تو شبِ مہیب کے ماروں کی بات ہے
آؤ کہ مل کے توڑیں شبِ ہجر کی فصیل
اس پار جگمگاتے ستاروں کی بات ہے
سمجھا نہیں جو گفتگو سادہ زبان میں
اُس کی سمجھ سے بالا اشاروں کی بات ہے
دانشورانِ قوم کی فردا سے التفات
یہ چند کی نہیں ہے ہزاروں کی بات ہے
جب تک حصولِ زر ہے ترا مقصدِ حیات
تیری ہر ایک بات خساروں کی بات ہے
وقتِ نزع قریب ہے بادِ سموم کا
ہر شاخ کی زباں پہ بہاروں کی بات ہے
تابشؔ ندی میں بدلے گا اک روز برف زاد
دم توڑتی کرن میں شراروں کی بات ہے

شہزاد تابشؔ/لاہور

میں پور پور تلک عشق میں نکھرنے لگا
ترا وصال محبت میں رنگ بھرنے لگا
تبھی سے میرے بزرگوں کو فکر ہونے لگی
میں ایک دن میں کئی بار جب سنورنے لگا
مزا خلوص میں ہوتا ہے، گفتگو میں نہیں
جسے سمجھ نہیں آئی وہ بات کرنے لگا
وہ جتنی دیر سے ڈوبا مری محبت میں
میں اتنا جلد ہی اشعار میں اُبھرنے لگا
ہمارا ساتھ نبھائے وہ کیسے ممکن ہے
جو اپنے خون کے رشتوں سے بھی مکرنے لگا
ہر ایک لفظ کی آنکھوں سے اشک بہنے لگے
سنے کو ان سنا کر کے کوئی گزرنے لگا
ہوائے ہجر نے ہر نقش جب مٹا ڈالا
تو ایک دن ترا شہبازؔ بھی بکھرنے لگا

پروفیسر شہباز نیرؔ/رحیم یار خان

نارسائی کا بدن میں رنگ گاڑھا رہ گیا
یاد بس پہلی محبت کا پہاڑا رہ گیا
تخلیے میں یہ نکالا ہے نتیجہ سوچ کر
جیب میں چند آخری سانسوں کا بھاڑا رہ گیا

گرمیاں تو کٹ گئی ہیں پیڑ کے سائے تلے
سر پہ باقی اب خدارا اور جاڑا رہ گیا
جانے ایسا کون سا جادو ہے بوڑھے پیڑ میں
پیڑ پہ پتا ہوا نے جو بھی جھاڑا رہ گیا
بستیوں میں اب قبیلے ہیں نہ وہ پہلے سے لوگ
بستیوں میں یار باقی اب اُجاڑا رہ گیا
کیا خبر یہ جنگ کیسے ہوتے ہوتے رہ گئی
کون جانے کس لیے خالی اکھاڑہ رہ گیا

راؤ وحید اسد/ ملتان

تم سے اب رابطہ نہیں کرنا
کہہ دیا نا کہ جا، نہیں کرنا
عشق پہلا ہی آخری ہوگا
دوسرا تیسرا نہیں کرنا
اپنے ہاتھوں تراش کر پتھر
میں نے اپنا خدا نہیں کرنا
ہے اجازت تمہیں چلے جاؤ
پر مرا سامنا نہیں کرنا
مانتا ہوں بہت حسیں ہو تم
ہاں مگر دلربا نہیں کرنا
موت مجھ کو قبول ہے پھر بھی
بے رُخی کا گلہ نہیں کرنا
میرے گھر کو جلا کے رکھ دے جو
ایسا روشن دیا نہیں کرنا
تیرنا آئے یا نہ آئے اکمل
تم کو پر ناخدا، نہیں کرنا

اکمل حنیف/ لاہور

ترا مزاج زیادہ ہی بزدلانہ ہے
تجھے ہے عشق مگر عشق غائبانہ ہے
تمام عمر یہاں آ کے رہ بھی سکتے ہو
کہ حق تمہارا مرے دل پہ مالکانہ ہے
تمہیں یہ کس نے کہا ہے کہ میں اکیلا ہوں
اکیلے پن سے مرا گہرا دوستانہ ہے
قدیم پیڑ کو بے فائدہ سمجھتے ہو
نجانے کتنے پرندوں کا آشیانہ ہے
یوں لگ رہا ہے مجھے مل رہے ہو آخری بار
لپٹ کے ملنے کا انداز والہانہ ہے
کوئی بھی بات ہو طاہر وہ مجھ سے کہتے ہیں
تمہاری باتوں کا انداز شاعرانہ ہے

طاہر عدیل/ ڈنمارک

خاص ہوتا ہے مرے دوست ہر اک کام کا وقت
کتنا اچھا ہے اُداسی کے لیے شام کا وقت
ہم جو رہتے ہیں شب و روز مشقت میں مگن
ایک ہی بار ملے گا ہمیں آرام کا وقت
عمر اس شہر میں اس طرح کٹی ہے جیسے
متقی لوگوں میں گزرے کسی بدنام کا وقت
اپنے اندر سے نکلنے کی ضرورت ہے میاں
کشف کا وقت ہے یہ اور نہ الہام کا وقت
کتنا دلدوز تھا اس شخص کی رُخصت کا سمے
ہم نے ہنس ہنس کے گزارا تھا وہ کہرام کا وقت

عبیداللہ نزاکت/ حاصل پور

نصیحت میں اضافہ ہو رہا ہے
اذیت میں اضافہ ہو رہا ہے
میں ہوں جب سے کسی کی دسترس میں
ودیعت میں اضافہ ہو رہا ہے
محبت کرتے کرتے رو پڑے ہیں
عقیدت میں اضافہ ہو رہا ہے
مجھے محتاط اب رہنا پڑے گا
کہ زینت میں اضافہ ہو رہا ہے
میں چونکہ نعت بھی پڑھتا ہوں آصف
سو عزت میں اضافہ ہو رہا ہے

آصف انصاری/ لاہور

ذرا بھی صحبت بد کا اثر نہیں لگتا
جب اُس کی بات سے پہلے مگر نہیں لگتا
میں اپنے اشک کی وسعت کو جانتا ہوں مجھے
سمندروں کے تلاطم سے ڈر نہیں لگتا
تمہارے عشق میں شوریدگی نہیں آئی
کہ تجھ کو دشت و بیابان گھر نہیں لگتا
دکھا رہے ہو عزیزوں کی بزم میں کیوں کر
جگر کے چاک کو ٹانکا اِدھر نہیں لگتا
بچھڑنے والے کا تا عمر غم منانے دے
ہمارا دل کہیں بارِ دگر نہیں لگتا
جگر کا زخم چھپا کر جہان سے رکھئے
یہ آئینہ کبھی دیوار پر نہیں لگتا
سفر نصیب ہوا ہے اُسی کے ساتھ کہ جو
کسی طرف سے شریکِ سفر نہیں لگتا

ازور شیرازی

وبا کے خوف سے جاری ہے کال جینے کا
ارادہ پھر بھی رکھو اب کے سال جینے کا
میں مانتا ہوں کہ ہر سو ہے موت کا منظر
کسی طرح سے تو رستہ نکال جینے کا
یہ سوچ کر ہی غلامی کو رد کیا میں نے
کسی کے ذہن میں آئے خیال جینے کا
عذابِ جاں سے نکالے کسی طرح ہم کو
ہوا ہے جس کو بھی حاصل کمال جینے کا
میں اپنی عمرِ رواں کے طلسم سے نکلا
تو جان پایا فریبِ جمال جینے کا
فشارِ ذات سے ناآشنا نہیں پھر بھی
میں کر رہا ہوں مسلسل سوال جینے کا

ازور شیرازی

لباس عمر یقیناً بہت نیا ہوتا
جو اختیار میرے پاس خود مرا ہوتا
میری حیات میری دسترس میں ہی ہوتی
یا میری موت میرا اپنا معاملہ ہوتا
یا مجھ سے پوچھتا کوئی، کہ تم نے جینا ہے
یا مجھ کو موت کی تشکیل کا پتا ہوتا
اے کاش مجھ سے ستاروں کی پرورش ہوتی
میرا وثوق مہ و مہر پالنا ہوتا
میں روز کرتا کسی گل کے روبرو سجدہ
میری نوا میں کوئی آب جو ملا ہوتا
حلول کرتا میں ہر شب وجود میں اس کے
تو صبح نو نیا خوشبو کا سلسلہ ہوتا
یہ سارے مسلک و آئین و دیں نہیں ہوتے
یا پھر سبھی کا فقط ایک ہی خدا ہوتا
کمیلؔ روز یہ میرے لیے نئی ہوتی
یا زندگی کے لیے میں ہی کچھ نیا ہوتا

علی کمیل قزلباش

خوش ادا بننے لگے کچھ خوش نوا ہونے لگے
درد سے اب اس طرح کے آشنا ہونے لگے
خواہشوں کے پھول جو کھلنے لگے ہیں گھر یہ گھر
ہجرتوں کے دکھ بھی کیسے خوش نما ہونے لگے
پھر انہیں کی یاد میں کھونے لگے ہیں روز و شب
وہ ہمارے درد کی پھر سے دوا ہونے لگے
پھر بہاریں آ گئی ہیں کھل اُٹھے ہیں پھول بھی
پھر خیالِ بے نوا حرفِ رسا ہونے لگے
اک بڑا ویران سا صحرا تھا میرے سامنے
راستے میں چھوڑ کے وہ جب جدا ہونے لگے

فاروق احمد فاروق/گجرات

خدائے برتر زباں کے مالک! تو آج مجھ کو حساب دے جا
یہ میرے دل میں ہے درد کیسا بس آج اتنا جواب دے جا
میں آج پوچھوں گا تجھ سے وہ جو کسی نے پہلے نہ پوچھا ہوگا
یا میرے لفظوں کو قید کر لے یا میری روح کو عذاب دے جا
مجھے پتہ ہے تو دھڑکنوں کی خفیف لرزش سے آشنا ہے
یا میری لرزش کو موت دے دے یا پھر سے اس کو شباب دے جا
یہ دین و دنیا کی ساری باتیں میں چند دنوں میں سمجھ گیا ہوں
جسے سمجھ کر سمجھ نہ پاؤں اب ایسی مجھ کو کتاب دے جا
مرا ہی چہرہ اب آئنے میں مجھ ہی کو آنکھیں دکھا رہا ہے
یا میرا چہرہ ہی مسخ کر دے یا مجھ کو اپنا نقاب دے جا
سنا ہے ساقی! تو میکدے کے ہر ایک مے کش کو جام دے گا
قسم ہے تجھ کو میں مر رہا ہوں مجھے بھی تھوڑی شراب دے جا

پروفیسر حافظ شجاعت علی/بھلوال

دل کی اک نادانی آنسو
جیون روگ کہانی آنسو
اک فقرے میں لکھ دی کس نے
بچپن اور جوانی آنسو
بہتا جائے نمکیں ساغر
آنکھ سمندر پانی آنسو
شب بھر اُس کے پہلو میں تھی
کیسی شام سہانی آنسو
کاغذ گجرے زُلفیں خوشبو
اک کمرہ دیوانی آنسو
تیرے ہجر میں اتنا روئی
کر گئے نقل مکانی آنسو
وقت کے چہرے پر ٹھہری ہے
اسماؔء ایک نشانی آنسو

سیّدہ اسما جعفری/بھلوال

میری سانسوں میں وہ سمایا ہے
خوشبوئیں لے کے پاس آیا ہے
روز سنتا ہوں گیت چڑیوں کے
صحن میں آشیاں بنایا ہے
وصل کی بات دو دنوں کی تھی
ہجر نے ساتھ پر نبھایا ہے
درد کی کیفیت بھی میٹھی ہے
گھاؤ اک شوخ نے لگایا ہے
میں نے رسماً کہی تھی بات اُسے
اُس نے کتنا برا منایا ہے
بے وجہ میں یہاں نہیں آیا
آپ نے خود مجھے بلایا ہے
اُس کی چپ سے مجھے یوں لگتا ہے
کوئی گہرا سا زخم کھایا ہے
اک تپی دھوپ میرے سر پر تھی
سایا بن کے جہاں میں آیا ہے
اُس کی آنکھوں کو غور سے دیکھو
اک زمانہ وہاں سمایا ہے
دیکھنا آئے گا وہ دوڑا ہوا
میں نے وہ نازؔ گیت گایا ہے

وحید ناز/لاہور

بے سبب سننے مسکرانے سے
رنج چھپ جائے گا زمانے سے
وقت کی واپسی نہیں ہوتی
گھڑی کی سوئیاں گھمانے سے
آگہی کا مرض لگا ہم کو
اک محبت کے کارخانے سے
کتنے منظر بدل گئے ہیں دوست
گھر کی دیوار کو گرانے سے
ہم پہ واجب تھا احترام اُس کا
اس کو نسبت تھی اک گھرانے سے

قاسم رضا مصطفائی/گجرات

نوچندی جمعرات

شائستہ مفتی/کراچی

آج پھر نوچندی جمعرات ہے۔

الہڑ ناری نے شام کے آسمان پر نظر ڈالی تو عین وسط میں نوچندی کا ہلال نئی دلہن کی طرح چمک رہا تھا۔ ہلال کے ایک کونے پر ایک چمکدار ستارہ یوں لگا جیسے کہ کسی کے کمانی دار ہونٹوں کے نیچے ایک تل جگمگا رہا ہو۔

اِک رادھا،، ایک میرا۔۔۔

دونوں نے شیام کو چاہا۔۔۔۔

وہ ایک ناری ہی تو تھی، دھیمے دھیمے سروں میں گنگنا رہی تھی۔ آج کوئی خاص بات ہے کیا؟

ہاں شاید!

آج نوچندی جمعرات ہے۔ چاند کی پہلی جمعرات۔۔

آج وہ خوب سجے گی، خوب گنگنائے گی، خوب شرمائے گی۔ نوچندی جمعرات کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ آج کوئی اُس کے رستے میں نہیں آئے گا۔ سب ہی راستہ چرا کر گزر جائیں گے، ایک عجیب سی وحشت تھی اُس کی آنکھوں میں، ایسی وحشت جو دور سے نظر آ جاتی ہے۔ کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ ناری کا رستہ کاٹ سکے۔ سہ پہر ڈھلتے ہی گلی کے نکڑ سے وہ بہت سے گجرے خرید لائی تھی۔ موتیا کی خوشبو ناری کے دل و دماغ پر کسی نشے کی طرح چڑھ چکی تھی، بالوں میں چنبیلی کا تیل ڈال کر لمبی چٹیا گوندھی، خمار آلودہ آنکھوں سے ناری نے آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیا۔ بسنتی رنگ کی ساڑھی میں لپٹا اُس کا سراپا، وہ اب بھی نوخیز لگ رہی تھی۔ ایک اَدھ کھلی کلی کی طرح، ایسی کلی جو کبھی مکمل پھول نہ بن پائی۔ شاید مگس اُس کی طرف آتے آتے راستے میں ہی کہیں گھو گیا۔ جانے کس منحوس گھڑی کی بددعا تھی جو ناری دن رات جلتی رہتی مگر برسات کسی اور ہی چھت پر برس جاتی۔

وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ سب لوگ ایک دوسرے کو جانتے تھے، کون آیا، کون گیا، کسی سے کچھ پوشیدہ نہ تھا۔ سامنے والے گھر میں کچھ نئے لوگ آ کر بسے تھے۔ پورے محلے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کب تک رہیں گے؟

ایک دن وہ گھر کی چھت پر کپڑے پھیلانے گئی تو اُس نے دیکھا کی ایک خوبرو نوجوان سامنے والے گھر سے نکلا۔ دروازے کے پیچھے سے کسی نے ٹفن پکڑایا اور وہ سیدھا لمبے لمبے قدم اُٹھاتا کسی سمت نکل گیا اور ناری دیکھتی ہی رہ گئی۔ یوں لگا جیسے جانے والا اپنے پیچھے پھولوں بھرا راستہ چھوڑ گیا ہو۔۔ ناری اُس راستے پر چلنا چاہتی تھی۔۔۔ مگر وہ صرف دیکھتی ہی رہ گئی۔

ایک دن وہ رسوئی میں روٹیاں پکا رہی تھی کہ کسی نے بتایا کہ سامنے والے گھر میں کوئی پڑھے لکھے بابو رہنے آئے ہیں۔ بابو کا ذکر آیا تو ناری کے کان کھڑے ہوئے۔

اور سنا ہے بابو کی کامنی سی بیوی بھی ہے اور ایک پیاری سی چھوٹی منی بھی ہے۔

اچانک ناری کا ہاتھ جلتے توے پر پڑ گیا۔ ہائے! پتہ نہیں یہ ہائے ہاتھ جلنے کی تھی یا دل!

ناری کا دل کسی چیز میں نہ لگا۔ دن ہو یا رات ہر لمحہ وہ سامنے والے گھر کا جائزہ لیتی رہتی من ہی من میں تڑپتی رہتی۔۔۔ بابو کی صرف ایک جھلک کے لیے۔۔۔ دل و دماغ کو کسی سے سکون نہ ملتا۔ سامنے والے گھر سے کبھی کبھی کسی کے ہنسنے کی آوازیں بھی آتیں۔ کبھی کسی بچے کی کلکاریاں بھرنے کی آوازیں بھی آتیں۔ ناری اندر ہی اندر بھڑک بھڑک کر رہ جاتی۔۔۔ کاش کہ بابو مجھے مل گیا ہوتا! میں تو شاید اس کی پوجا کرتی۔۔۔ بابو کو پتا ہی نہیں کہ وہ کتنا چاہے جانے کے لائق ہے۔ میں تو اُس کی ایک داسی ہی بن کر جینا چاہوں گی اور پھر وہ خیالوں ہی خیالوں میں بابو کے ساتھ رہنے لگی۔۔۔ حقیقت کیا ہے؟ ناری کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اسی ایک خواہش نے ناری کے پورے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا اور وہ خود کچھ بھی نہ رہی۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلا اور وہ سب کے لیے پرائی ہوگئی۔۔۔ ناری ایک سراپا دیا بن کر سرِ شام جلتی جسے کسی منڈیر پر کوئی رکھ کر بھول گیا ہو۔۔

شاید وہ نوچندی جمعرات ہی تھی جب گھر کے دروازے پر جمعراتی بابا نے صدا لگائی۔۔ 'پھر آیا جمعرات کا جمعراتی بابا۔۔ ہے کوئی جو بابا سے دعا لے۔۔۔ ہر مراد پوری ہوگی'۔ ناری دوڑ کر دروازے پر آئی۔۔۔ 'بابا! میرے پاس تمہیں دینے کو تو کچھ نہیں ہے مگر ایک مراد ہے جو مجھے چین نہیں لینے دیتی، کیا تم میرے لیے دعا کر سکتے ہو'۔ بابا نے چھوٹی چھوٹی آنکھیں سکیڑ کر کہا:

دعا تو میں مانگ لوں گا مگر تمہیں کچھ دینا تو ہو گا۔ کیا دو روٹی کا آٹا بھی نہیں تمہارے پاس؟

ناری اُلٹے قدموں گھر کے اندر گئی اور چھوٹی پرات میں دو روٹی کا آٹا لے آئی۔ بابا نے جھولی

پھیلائی اور آنا اُس کی جھولی میں سما گیا۔ بابا نے شفقت سے ناری کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور محبت آمیز لہجے میں پوچھا کیا مراد ہے تمہاری؟ ناری اِس سوال پر سسک پڑی۔ آنسو موتی بن بن کر رخسار پر بہہ نکلے۔

بابا نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے صدا لگائی: 'تیری مراد ضرور پوری ہوگی'۔

ناری میں جانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی: 'بابا یہ سامنے والے گھر میں میرا جیون ساتھی رہتا ہے مگر وہ کسی اور کے ساتھ رہتا ہے آپ کو تو پتا ہوگا، وہ صرف میرا ہے صرف میرا ہے، میں چاہتی ہوں اُس کا گھر ٹوٹ جائے اور وہ میرے پاس آ جائے اور صرف میرے ساتھ رہے'۔

ناری یہ سب کہہ کر خود ہی اپنے اجنبی لہجے پر حیران ہو گئی۔ اُس کے الفاظ فضا میں چنگاریوں کی طرح فشار بن کر پھیل گئے۔ نارنجی رنگ کی چنگاریاں جو سب کچھ جلا کر بھسم کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھیں ناری نے ایک لمحے کو رک کر سوچا۔ کیا یہ میں ہوں؟ ہاں! یہ میں ہی ہوں؟ زندگی میں اگر مجھے بابو نہ ملا تو اور رکھا ہی کیا ہے میرے پاس!۔

بابا جی ایک گہری خاموشی میں ڈوب گئے۔ آنکھیں بند کر کے وہ جانے کیا سوچتے رہے اور پھر جب انھوں نے آنکھیں کھولیں تو اُن کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے لمبے سے جبے کی جیب سے ایک تعویز نکالا اور ناری کے ہاتھ میں تھما دیا۔۔۔ یہ تعویز بابو کو گھول کر پلا دینا۔۔ آج نوچندی جمعرات ہے۔۔۔ نوچندی جمعرات کو سلگایا ہوا چراغ کبھی نہیں بجھتا، کوئی اگر اس چراغ کو بجھانے کی کوشش کرے تو خود جل کر راکھ ہو جاتا ہے'۔

ناری نے تعویز اپنی مٹھی میں دبا لیا جیسے تعویز نہ ہو بلکہ اس کی زندگی ہو۔ اُس شام ناری کی سج دھج دیکھنے والی تھی۔ گلابی چنریا جس کے چاروں طرف کرن لگی تھی، گالوں پر غازہ کی ہلکی سی تہہ، ماتھے پر سنہری بندیا، مانگ میں افشاں کی دھار، بانہوں میں گجرے۔ چپکے چپکے ناری نے ساری تیاری مکمل کر لی۔ دودھ میں زعفران گھولا اور بابا کا دیا ہوا تعویز ڈال کر گلاس تپائی پر رکھ دیا۔ سرِ شام ہی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ بابو آتا ہی ہوگا! شام کی شفق دھیرے دھیرے آسمان کو گلابی کر رہی تھی۔۔۔ اور پھر وہ دور سے آتا دکھائی دیا۔

گلی کے نکڑ سے مڑ کر اُس نے سیدھا اپنے گھر کا رستہ لیا۔ ناری نے جلدی سے دودھ کا گلاس اُٹھایا اور بیچ راستے میں آ کھڑی ہوئی، بابو رستہ بچا کر نکلنا چاہتا تھا مگر ناری نے پیچھے سے آواز دی۔ بابو ٹھٹھک کر رکا:

'مجھ سے کچھ کہا آپ نے؟' بابو کی ذہین آنکھوں میں حیرانی تھی۔ وہ آنکھیں۔۔۔۔ اُن آنکھوں میں وہ ڈوب کر اُبھر ہی نہ پائی۔۔ بس ڈوبتی چلی گئی۔۔۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بابو نے جانے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ ناری نے جھٹ سے دودھ کا گلاس آگے کر دیا:

'یہ فاتحہ کا دودھ ہے امی نے بھیجا ہے'۔ بابو حیران نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ ناری پھر گویا ہوئی۔ 'وہ امی نے منت مانی تھی کہ اچھا پڑوس ملے۔۔۔ اور آپ لوگ تو بہت اچھے ہیں اس لیے آپ کے لیے'۔ بابو نے ہچکچاتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا کر گلاس پکڑا اور جانے لگا۔ ناری جھٹ سے بولی:

'آپ ابھی پی لیں ورنہ گلاس دینے آنا پڑے گا'۔ بابو کسی سوچ میں پڑ گیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی گلاس ہونٹوں سے لگا لیا'۔ خالی گلاس اُس کی طرف بڑھایا اور تیزی سے گھر میں داخل ہو گیا۔ ناری کا انگ انگ خوشی سے ناچنے لگا، بس ہو گیا کام۔۔!

جیسے گھڑی چلتی ہے ٹک ٹک ٹک ناری کو انتظار تھا کچھ ہونے والا ہے۔ دوپہر کا آسمان، آگ برساتا سورج، رات کو چاند تارے چپ سادھے کسی انہونی کے منتظر تھے۔۔۔ ٹک، ٹک، ٹک۔۔۔۔

ایک سہ پہر ناری گھر کے آنگن میں لگے نیم پر چڑیا کے گھونسلے کو غور سے دیکھ رہی تھی اچانک ہی سامنے والے گھر سے کسی کے چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں، کچھ دیر تو کسی کی سمجھ نہ آیا کہ معاملہ کیا ہے؟ کافی دیر بعد سمجھ آیا کہ سامنے والے گھر میں لڑائی جھگڑا ہو رہا ہے۔ سب حیران تھے کہ اس ہنستے بستے گھر کو کیا ہو گیا ہے؟ ناری نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور مسکرانے لگی جیسے رب کا شکر ادا کر رہی ہو۔ پہلی منزل تو پار ہو ہی گئی۔

'ارے بابو تو صرف میرا ہے۔۔۔! میں ہی تیری رانی ہوں'۔

بابو کی بیوی کے بارے میں سوچ کر ناری کے دل میں ایک شدید نفرت کی لہر اُٹھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ ابھی جا کر اُس کو کسی بے جان گڑیا کی طرح کہیں دور دفن کر آئے۔

سارے محلے والے حیران تھے جس گھر سے ہنسنے بولنے کی آوازیں آتی تھیں، آخر ایسا کیا ہوا کہ وہاں سے صرف لڑائی کی آوازیں آنے لگی ہیں۔ صرف ناری ہی جانتی تھی کہ نوچندی جمعرات اب آنے ہی والی تھی اور صرف ایک تعویز اور پلانا ہے بابو کو اور پھر

بابو ہمیشہ کے لیے اُس کا ہو جائے گا۔

اِس بار نوچندی جمعرات پر ناری نے پہلے سے بھی زیادہ اہتمام کیا۔ لال دوپٹہ پر سکیا لگائی، قمیض کے گلے پر چمپا لگائی، بالوں میں چنبیلی کا تیل ڈالا اور ماتھے پر سنہری بندیا، گجرے بانہوں میں اور مانگ میں افشاں۔ جمعراتی بابا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر جمعرات ناری کو ایک تعویز دے کر جائے گا جب تک کہ اُس کی مراد بر نہ آئے گی۔ شام کو جمعراتی بابا نے صدا لگائی تو ناری دو روٹی کا آٹا لیے پہلے ہی سے دروازے پر موجود تھی۔۔۔ بابا نے آٹا لینے کے لیے جھولی پھیلا دی اور ایک ہاتھ سے تعویز ناری کے ہاتھ پر رکھ دیا۔۔۔

نیا نکور ہلال جب آسمان پر نمودار ہوا تو ناری نے اپنی آنکھیں بند کیں اور تصور میں بابو کے ساتھ بہت دور نکل گئی۔ آج جانے کیوں بابو کو بہت دیر ہو گئی۔

کب سے زعفران ملے دودھ کا کلاس لیے وہ بیچ رستے پر کھڑی تھی۔ شام کے سائے جب رات کے اندھیرے میں گڈمڈ ہونے لگے تو ناری کو بابو کا سایہ نظر آیا۔ بوجھل اور تھکے تھکے قدموں کے ساتھ وہ چلتا ہوا گھر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ناری کو یوں لگا جیسے وہ گھر جانا ہی نہ چاہ رہا ہو مگر پھر بھی مجبور ہو۔ ناری نے دل ہی دل میں بابو کو دلاسہ دیا:

'بس کچھ دن اور۔۔۔ پھر میں ہوں نا آپ کی داسی! سب ٹھیک ہو جائے گا'۔۔۔

بابو نے خالی خالی آنکھوں سے ناری کو دیکھا۔

بابو کی بے خواب آنکھوں میں ایک سوالیہ نشان تھا۔ ناری کو کچھ بن نہیں پڑا تو جھٹ بہانہ بنا کر بولی:

'بابو میں نے دسویں پاس کر لی ہے نا، اِس لیے، اماں نے منت مانی تھی'۔

بابو کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر اُس کی جانب بڑھا اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گیا اور بغیر رکے اپنے گھر کی جانب چل دیا۔

جیسے طوفان گزر جانے کے بعد سکوت چھا جاتا ہے ایسے ہی ہر طرف خاموشی چھا گئی، اب نہ لڑنے جھگڑنے کے آوازیں آتیں اور نہ ہی کسی بچے کی رونے کی آواز آتی، بالکل خاموشی۔۔۔ لگتا تھا سامنے والے کہیں چلے گئے ہیں مگر سامان تو کسی نے جاتے نہ دیکھا، پھر کہاں گئے یہ لوگ، رات کو بھی اس گھر پر اندھیرا چھایا رہتا۔۔۔ کہیں کوئی چراغ نہ جلتا، حیرت ہی ہے کہاں گئے یہ لوگ؟

ناری کو یقین تھا کہ نوچندی جمعرات کو بابو ضرور آئے گا۔۔۔ میری کشش اُسے لائے گی؟

لمحہ لمحہ بوجھ بن کر گزر رہا تھا اور پھر آخر کار نوچندی جمعرات آ ہی گئی۔ شام سے پہلے ناری نے خوب اپنے آپ کو سجایا اور سنوارا۔۔۔ رات گئے تک کھڑکی میں کھڑے ہو کر بابو کا انتظار کیا۔۔۔ مگر اُسے مایوسی ہوئی۔۔۔ اچانک سامنے والے گھر میں مدھم سی روشنی دکھائی دی۔۔۔ بابو!

ناری نے جلدی سے ایک مٹی کا دیا اُٹھایا اور رستہ پار کر کے سامنے والے گھر کے سامنے پہنچ گئی، سامنے کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ دیا ہتھیلی پر جمائے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی گھر کے دالان میں پہنچ گئی جس کمرے میں سے روشنی آ رہی تھی، وہاں ایک لڑکی سفید دوپٹہ اوڑھے سامان باندھ رہی تھی۔۔۔

ناری نے قریب پہنچ کر لڑکی کو مخاطب کیا: 'بابو کہاں ہے؟

لڑکی نے اپنا چہرہ اُٹھایا تو ناری کو احساس ہوا کہ سفید دوپٹے میں لپٹے اُس لڑکی کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ 'کون بابو'؟

ناری کیا جواب دیتی وہ تو بابو کا نام تک نہ جانتی تھی۔۔۔ کانپتے ہونٹوں سے ناری نے پھر سوال کیا:

'وہ جو یہاں رہتے تھے'۔

اُس لڑکی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھار نمودار ہوئی۔ نظریں جھکا کر لڑکی نے جواب دیا:

'وہ تو گزر گئے۔ اُن کی تدفین بھی ہو چکی ہے۔ میں اپنے بچے کا کچھ سامان لینے آئی ہوں'۔

ناری کے ہاتھ سے مٹی کا دیا زمین پر گر کر چکنا چور ہو گیا، ہر طرف تیل ہی تیل پھیل گیا، ناری کے سر سے چمکدار چنری زمین پر گری اور چنری نے آگ پکڑ لی۔ اچانک آگ سے اندھیرے کمرے میں ہر طرف خوفناک ہیولے بننے لگے جیسے بہت سی روحیں ماتم کناں ہوں۔۔۔!

نوچندی کا ہلال آسمان پر مسکرا رہا تھا اور ایک ستارہ چاند چھونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور پھر یونہی ہونے لگا۔ ہر نوچندی جمعرات کو جب ہلال آسمان پر مسکراتا۔۔۔ ناری کے چہرے پر بھی ایک وحشت زدہ مسکراہٹ آ جاتی اور وہ بڑے چاہ سے تیار ہوتی، بالوں میں چنبیلی کا تیل ڈالتی

گالوں پر غازہ لگاتی اور ماتھے پر سنہری بندیا سجا کر مٹی کا دیا لے کر گلی میں نکل جاتی۔۔۔ بچے بوڑھے اور جوان اُس کی آنکھوں کی وحشت سے ڈر جاتے اور دور ہی سے اپنا رستہ بدل لیتے۔

☆☆☆

چوبارے کی محبت

نوین روما/لاہور

مجھے یاد نہیں کہ عورت کے دل میں محبت کی بارشیں کس وقت شروع ہوتی ہیں یا کوئی کب کس وقت دل میں گدگدیاں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یاد ہے تو صرف یہ کہ وہ دسمبر کی خوشگوار چمکیلی دوپہر تھی اور میں بہت دنوں کے بعد نہا کر اپنے بال سوکھانے چھت پر گئی تھی، ہر چیز کتنی اچھی لگ رہی تھی گرم دھوپ میرے گیلے بال ،تولیے سے میرے لمبے بال چھاڑنے سے چوڑیوں کی کھنک اور چھت پر اُڑتی رنگ برنگی پتنگیں بلکل یوں لگ رہی تھیں جیسے میں نے پنی پھولدار چُنی کو زور سے جھٹکا ہو اور اس کے سارے پھول آسمان پر بکھیر گئے ہوں۔ جس دن سے میرا آٹھویں جماعت کا آخری پرچہ ہوا گویا آزادی مل گئی تھی۔ تولیے کو دھوپ میں ڈال کر میں نے ایک زوردار انگڑائی لی اور جھومنے لگی ابھی اپنے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو نیچے بھی نہ کر پائی تھی کہ سامنے گھر کے چوبارے پر کھڑے ایک لڑکے پر نظر ٹھیری جو چوری چھپے اپنی مٹی کی دیوار سے لگا مجھے بٹر بٹر دیکھے جا رہا تھا، حالانکہ اس کے اور میرے درمیان ہماری گلی اور اس سے آگے دو مکان چھوڑ کر بڑا مکان تھا۔۔اس کا۔۔مگر میں یکدم یوں شرما کر نیچے بیٹھ گئی جیسے ہمارے گھر کی دیوار سے لگا بیٹھا تھا۔ میں شرمندہ سی ہو کر کتنی ہی دیر دیوار کی اوٹ میں بیٹھی رہی اور من ہی من میں سوچنے لگی کہ ایسی انگڑائی تو فلم میں منیشا ۔۔۔۔لے رہی تھی۔ یہ لڑکا کیا سوچتا ہوگا جیسے کہ میں ہی وہ گانا گا رہی ہوں" کیوں نئی لگ رہی ہے یہ دھر تی پون" ان دنوں یہ گانا مشہور جو بہت تھا۔ تھوڑی دیر ایسے ہی دل تھامے میں بیٹھی رہی پھر دیوار کی جالی سے دیکھا تو وہ وہی کھڑا تھا۔ میں اس سے کیوں ڈر رہی ہوں؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ چلو نیچے چلتی ہوں میں یکدم کھڑی ہوئی اور دوڑتی ہوئی سیڑھیاں اتر کر دھم سے نیچے آ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

اماں کوئی کام ہو تو بتاؤ؟ میں یونہی کھسیانی سے ہو گئی۔

اماں نے اپنے موٹے موٹے چشموں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

اے لڑکی تیری طبیعت تو ٹھیک ہے آج ؟ اماں پے یہ نظر کرم وہ بس فراغت ہے نا تو سوچا اماں کا ہاتھ ہی بٹا دوں ، فارغ بیٹھے بیٹھے بور ہو رہی ہوں ، میں نے بے فکری سے کہا۔

کل تو تیرا آخری پرچہ تھا آج انقلاب آ گیا چلو اچھا ہے تمہیں کچھ فلم ،ٹی وی کے بے ہودہ گانوں سے ہٹ کر کچھ خیال تو آیا، اچھا ہے اماں نے جتنی تیز چھری سے آلو کاٹ رہی تھی اتنے ہی تیزی سے میرے گانا سننے کے شوق پر بھی طنز کے تیر برسانے لگی۔ اماں کیا ہو گیا؟ جو کبھی کبھار گیت مالا کا پروگرام ٹی وی پر دیکھ لیتی ہوں، وہ بھی ہفتہ بھر کے بعد آتا ہے اور اک آدھ گانا واک مین پر۔ مجھے اماں کا اس وقت طنز کرنا بہت برا لگ رہا تھا۔ میں دھیرے دھیرے پلنگ پر بڑے کمبل کو اپنے اوپر لے کر لیٹ گئی اور جھٹ سے تکیے کے نیچے سے اپنا واک مین نکال کر ہیڈ فون لگا کر پلے کا بٹن آن بھی کر چکی تھی۔

ایک لڑکی کو دیکھا تو ایسا لگا ، لالالا ، اماں کی آواز کہیں دور بیک گراونڈ میں دب چکی تھی میں نے مزے سے آنکھیں موند لیں۔

ارے یہ کیا وہ چوبارے پر کھڑا لڑکا جھٹ سے میرے ذہین میں آ گیا۔ لمبا چوڑا، سمارٹ لمبے گھنے سیاہ بالوں والا ، گھنی مونچھیں اور آنکھوں پر چشمہ، ہا ئے یہ کیا بات ہوئی۔

جی چاہا چھت پر جا کے دیکھوں کیا پتہ وہ اب بھی وہی کھڑا ہو۔

نہیں نہیں اماں پوچھے گی بار بار اوپر کیوں جا رہی اور وہ پاگل تھوڑی ہے جو ابھی تک وہیں کھڑا ہوگا۔

میں گانے سنتے سنتے نہ جانے کب سو گئی اماں کے زور زور سے جھنجھوڑنے پر میری آنکھ کھلی۔

اے لو میرا ہاتھ بٹانے کا بول کر خود سو گئی اُٹھ جا شام سر پر آ گئی اس وقت سونا نحوست ہے نری نحوست میں سپنوں سے جاگ کر جلد سے اُٹھ بیٹھی ، آ رہی اماں آ رہی۔

آنے والے دن بڑی خوشیوں بھرے تھے کیونکہ بسنت آ رہی تھی جو لاہوریوں کی جان، شان آن اور مان تھی ہمارا گھر بھی مہمانوں سے بھرنے والا تھا، تایا ابا، پھوپھو کی فیملیاں آئیں گی، کیا مزے آئیں گے؟

میں تو سپیشل پیلا جوڑا بنواؤں گی خوب مزے آئیں گے، چوڑیاں اور سینڈل بھی لینے ہیں اور ہاں کالا چشمہ، مجھے سارے پلان یاد آنے لگے۔ لو جی اور سب سے بڑھ کر گانوں کے نئے نئے کیسٹ بھی خریدنے ہیں، پتنگیں اور ڈوریں تو لڑکوں کے کام ہیں ہم لڑکیاں تو اپنے الگ ہی شغل کرتی ہیں۔ بسنت سے پہلے کے جمعے کو بسنت کی تیاریاں والا یا بسنت کی مایوں بھی کہتے ہیں۔ ذرا بسنت کی ریہرسل ہی ہو جائے اس میں بھی بڑا مزا آتا ہے اور میں خوب خوش ہو رہی تھی کہ کل جمعہ ہے میں نے اپنی بہنوں کے ساتھ خوب مزے کروں گی۔ اگلے دن میں صبح ہی صبح ٹیپ ریکارڈر آن کر کے سارے گھر کو چکا چکی تھی کچن میں اماں کا ہاتھ بٹانے کے بعد میں نہا کر چھت پر گئی تو بے ساختہ میں نے تار پر تولیہ ڈالتے ہوئے اس لڑکے کے گھر کی طرف دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا میں جلدی سے نیچے آ گئی اور تیار ہونے لگی۔ جمعہ کی نماز کے بعد پھوپھو کی فیملی آ گئی۔ میری پھوپھو زاد میری بہت اچھی دوست تھی، ہم سب کزنز چھت پر چلے گئے سفید گڈے نیلے آسمان پر بہت بھلے لگ رہے تھے۔ بھائی نے جیسے ہی ٹیپ ریکارڈر آن کیا تو ڈیک کے سپیکروں سے گانے بجنے شروع ہو گئے۔ لیکن۔۔۔ ٹین ٹین ۔۔۔ کی آواز سے یکدم گانے بجنے بند ہو گئے، او ہو کیسٹ کی ریل پھر پھنس گئی۔ بھائی جلدی لگاؤ نا تمہاری کھٹارا ٹیپ بار بار اڑتی رہتی ہے۔

میں نے پیار تمہیں سے کیا، میں نے دل بھی تمہیں کو دیا ہے۔ اب چاہے جو سو ہو یہ گانا اچانک اونچی

آواز میں لگ گیا۔

میں اور میری کزنز نے ایک ساتھ گردن گھمائی تو اسی ہینڈسم لڑکے کے گھر سے یہ آوازیں آرہی تھیں اور وہ دیوار کی اوٹ سے کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی منہ دوسری طرف پھیر لیا جیسے ہماری چھت پر موجود گھر والے کہیں یہ نہ۔۔ سمجھیں۔۔۔ کہ میں اسے دیکھ رہی ہوں۔ ارے واہ کیا رونقیں ہیں تیری طرف تو،، دیکھو تو ان کی چھت تو سارے مسٹنڈوں سے بھری پڑی ہے اس نے اس گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ہاں تو اور کیا ساری دنیا ہی اپنی چھتوں پر چڑھ۔۔۔ دوھوڑتی۔۔۔ ہے یار یہ دیکھ میں نے کتنے سارے نئے کیسٹ خریدے ہیں۔ میں نے اس کی توجہ ان کی چھت سے ہٹادی۔

اس شام میں بار بار اس لڑکے کی طرف دیکھتی مگر وہ بے پرواہی سے پتنگوں کے پیچ لگائی جا رہا تھا، سفید قمیض شلوار میں کالا چشمہ لائے۔ شام جب ڈھل گئی تو بھائی بولا چلو لڑکیو نیچے چلو اب تمہارا ٹائم ختم، ہم منہ بسورتیں نیچے آگئیں۔ پھوپھو کی فیملی ہمارے گھر رک گئی، اگلی صبح میں دھلے کپڑے چھت پر ڈال رہی تھی تو مجھے ایسے لگا جیسے کوئی مجھے مسلسل دیکھ رہا ہے۔ فوراً ہی اس کی چھت پر دیکھا تو وہ سچ میں کھڑا تھا۔ ویسے ہی چوبارے کے ساتھ چپکا کھڑا تھا۔ میں گھبراتی گھبراتی تار پر کپڑے پھیلا رہی تھی اور اِردگرد دیکھ رہی تھی کہ دوسری چھت پر تو کوئی نہیں؟ مجھے یوں لگ رہا تھا میں کسی امتحانی مرکز میں ہوں اور وہ میرا نیچر ہے جو پرچہ کرتے سٹوڈنٹ کو دیکھ رہا ہوتا ہے اور سٹوڈنٹ کو پرچہ آتا بھی ہے پر وہ یونہی گھبرا جاتا ہے۔ کپڑے ڈالتے ڈالتے میں اس کے بالکل سامنے والی دیوار پر آگئی اور ایک بڑی چادر دیوار پر ڈالنے لگی اور ہولے ہولے اسے دیکھنے لگی وہ مجھے ٹکٹکی لگائے تکے جا رہا تھا۔ چادر کو۔۔۔ میں ایسے سیٹ کر رہی تھی جیسے۔۔۔ پھیلانے میں دو منٹ لگتے لیکن میں نے پانچ منٹ سے بھی زیادہ لگا دیئے اور پھر ایک فائنل نظر اسکی طرف ڈالی تو اس نے اپنا ہاتھ ماتھے کی طرف لے جاتے ہوئے آداب کیا میں شرما گئی اور ہنستے ہنستے نیچے بھاگ آئی، دل تھا کہ بلیوں اُچھل رہا تھا نہ سمجھ میں آنے والی خوشی ہو رہی تھی۔ آنے والے دن میرے لیے بہت اہم تھے اور میں اس مرتبہ بسنت کے لیے خاص تیاریاں کرنا چاہتی تھی شاید اب کے مجھے کسی کو اپنا بسنتی جوڑا دیکھانا تھا۔ اماں مجھے۔، ٹائی اینڈ ڈائی۔۔۔ والا جوڑا چاہیے، پیلے رنگ کا اور ملتانی کھسہ، ہری پیلی چوڑیاں اور کالا چشمہ، میں نے اماں کو اپنی فرمائش سنا ڈالی۔ اے لڑکی ہوش کرو وہ جو ساتھ والوں کے لڑکے کی مایوں پر بنا تھا پیلا جوڑا وہ چولہے میں جھونک دیا کیا؟ اے خدا کی پناہ بسنت پر بھی ہمیں پیلے جوڑے پرنے شروع ہو گئے تو پھر اللہ ہی ہمارا حامیو و ناصر ہوگا۔ اماں پلیز پلیز پلیز اماں ایک بار۔ میں نے اماں کی خوشامدیں کیں۔ اے لڑکی یہ پیلے جوڑے آسمان سے نہیں ٹپکتے اتنا مہنگا سلک کا جوڑا ہے تیرا اور اب ایک اور نہ جی نہ۔ سن ایک کام کر تیری پیلی سلک کی قمیض بلکل سادہ ہے میں تجھے اچھی سی گولڈن لیس لا دیتی ہوں وہ لگا لے جوڑا ایک دم نیا ہو جائے گا۔ اماں نے بہت ہی قیمتی مشورہ دیا۔ ہاں اماں قیمتی جوڑا نہ سہی تو قیمتی مشورہ اچھا دیتی ہے، میں اماں کی اس بات پر خوش ہو گئی۔ ٹھیک ہے اماں جیسے تو خوش۔ میں مسکرا دی۔ آج شام کو بازار جاؤں گی تو لے آؤ گی اماں نے مجھے۔۔۔ پچکارتے۔۔۔ ہوئے کہا۔ شام کو اماں بازار گئیں اور میں کسی بہانے سے چھت پر۔۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا میں واپس آنے لگی تو نہ جانے وہ کہاں سے ٹپک پڑا، مجھے دیکھتے ہی آداب کیا۔ جواب میں میں صرف مسکرا دی اور سامنے دیوار پر آ کھڑی ہوئی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا، میں بھی مسکرائی۔ اس نے اپنا ہاتھ ٹیلی فون کے انداز میں کان سے لگایا اور دوسرے ہاتھ سے سوالیا اشارہ کیا۔ اوہاں یہ اپنا ٹیلی فون بتانا چاہ رہا تھا، میں نے اسے رُکنے کا اشارہ کیا اور دوڑ کر نیچے گئی اور اپنی کاپی اور پین لے آئی اور اسے اشارے سے کہا بتاؤ۔

اس نے ہاتھ کی انگلیوں سے کچھ نمبر بتائے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہو گونگے، بہرے بچوں کے سکول میں پڑھاتا ہے جو اسے اتنے کمال کے ہاتھوں سے بند سے بنانے آتے ہیں۔ فون کے چھ بند سے اس نے مجھے بتائے جو میں نے فوراً سے کاغذ کی چٹ بنا کر کاپی سے اُتار کر اپنی مٹھی میں لے لی اور نیچے آگئی۔ خوشی اور خوف کی انجانی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ ٹیلی فون بیٹھک میں پڑا تھا۔ اور وہاں کوئی تھا بھی نہیں۔ اگر کچھ تھا تو میرا خوف۔۔ بھائی کمرے میں سو رہا تھا اور مجھے بیٹھک تک اُس کے خراٹے آرہے تھے اور اگر ان کی آواز بند ہو جائے تو اس کا مطلب وہ جاگ گیا ہے۔ میں ڈرتے ڈرتے ہوئے بیٹھک میں گئی، میں آج ہی اس نمبر پر بات کرنا چاہتی تھی۔ اماں کے آنے سے پہلے میں نے بڑا حوصلہ کر کے نمبر ملایا سوچا کوئی آئے گا تو فوراً بند کر دوں گی۔۔۔ کسی لڑکے سے بات کرنا میری زندگی میں پہلی مرتبہ تھا، کانپتے ہاتھوں سے نمبر ملایا تو جھٹ گھنٹی گئی یعنی نمبر صحیح تھا، یار بڑا استاد ہے وہ میں نے سوچا۔ مگر مجھے تو اس کا نام بھی نہیں معلوم۔ یہ سوچ رہی تھی کہ دوسری گھنٹی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ کسی نے فون اُٹھایا دوسری جانب گہری خاموشی تھی یعنی وہ بھی بیتاب ہو کر فون کے سر پر ہی بیٹھا ہے تھوڑے توقف کے بعد کسی بھاری اور عمر رسیدہ آواز نے ہیلو کہا میں خاموش رہی۔

ہیلو: بولو نا۔۔ دوسری جانب سے آواز آئی۔

ہیلو: جناب بولیں۔

اُف خدایا یہ تو اس کے ابا ہیں بڑے میاں بولنے کا اسرار کئے جا رہے تھے، ہائے ہائے مارے گئے میں نے جلدی سے کال منقطع کی۔ اور وہی دل تھامے بیٹھی رہی۔۔۔ ہمت نہیں ہو رہی تھی دوبارہ کال کرنے کی میں جلدی سے بیٹھک سے باہر آگئی۔ دل میں سوچا یہ کیا بیہودہ حرکت کر رہی ہوں؟ یہ بھلا اچھی لڑکیوں کے چال چلن ہیں کیا اپنے محلے میں اشارے بازی اور اب فون اللہ کی پناہ کوئی دیکھے تو کیا سوچے گا اور کہیں گھر والوں کو بھینک بھی پڑ گئی تو مجھے تو سولی پر لٹکا دیں گے۔ میں نے جلدی سے عشاء کی نماز کی تیاری کی اور

اماں کا کمرہ ٹھیک کرنے لگی کچھ دیر بعد اماں بھی آ گئیں اور کمرے کی حالت دیکھ کر بڑی خوش ہوئیں۔ اماں میرے لیے خوبصورت لیس، بالوں کا کلپ، چوڑیاں اور جلیباں بھی لائیں تھیں۔ میں ان سب چیزوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی رہی۔ ایک دو دن ایسے ہی گزر گئے جس دن بسنت کی رات تھی اس دن شام تین یا چار بجے میں گھر کی خوب صفائیاں کر رہی تھی اماں بولی اُوپر لڑکوں نے خوب ڈوریں اور پنے پھینکے ہیں وہ بھی سمٹ لے مہمان آئیں گے تو بُرا لگے گا کہ اتنا کوڑا کرکٹ۔

میں جھاڑو لے کر اُوپر صحن میں پھیرنے لگی میں بے پرواہی سے جھاڑو چلاتے جا رہی تھی، سارا کوڑا سمٹتے ہوئے دیوار کی نکر تک گئی تو نظریں اچانک اُٹھیں تو وہ سامنے ہی کھڑا تھا جیسے میرا ہی انتظار کر رہا ہو میں تو گویا بھول ہی گئی تھی کہ کچھ دن پہلے اس سے آنکھ مٹکا ہوا ہے میں ایک دم کھسیانی سی ہوگئی اس نے جھٹ ہاتھ ماتھے پر لے جاتے ہوئے مجھے آداب کیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔ اس نے فوراً ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کہ فون کیوں نہیں کیا تھا میں نے گھبرکہ اِردگرد دیکھا اس نے پھر وہی سوال کیا تو میں نے کندھے اُچکا دیئے۔ اس نے اِشارہ کیا کہ وہ ابھی ہماری گلی میں آئے گا اور میں ایک چٹ ۔۔۔ پر اپنا نمبر بھی لکھ کر اسے دے دوں، گونگے بہروں کا ٹیوٹر کہیں کا۔۔ اولو میری تو جان ہی نکل گئی۔۔۔۔

اُس نے دوسری مرتبہ پھر انگلیوں کے زیک زیگ بنا کر کہا۔ کہ وہ آ رہا ہے۔ مجھے لگا وہ ابھی سوپر مین بن کر اُڑ کر ہماری چھت پر ہی نہ آ جائے۔ ڈر اور خوشی کے ملے جلے جذبات تھے ڈر دُنیا کا اور خوشی اس بات کی کہ کوئی مجھے سرا رہا ہے۔ اُف! یہ عجیب سا منہ بنا کر اُو کے کر دیا۔ یا اللہ میں تو گھر میں کام کرنے والی ماسی لگ رہی ہوں جھاڑو پھینکا اور جلدی سے نیچے آ گئی اور منہ ہاتھ دھو کر آنکھوں میں سُرمالگایا سر پر دوپٹہ اوڑھ کر شیشے میں دیکھا تو میں واقعی ہی وہ لگ رہی تھی۔ اِک لڑکی کو دیکھا تو ایسا لگا۔۔۔ ہاہائے خود ہی شرما گئی۔ اب باہر کیسے جاؤں، ایک بہانہ فوراً ذہن میں آ گیا۔

الماری کی طرف بڑھی اور اپنی پیلی سلک کی قمیض نکالی، شاپر سے لیس نکالی اور سب چیزوں کو ایک شاپر میں ڈال کر کمرے سے باہر نکلنے لگی تو یاد آیا اپنا ٹیلی فون نمبر تو لکھا ہی نہیں اپنے سکول بیگ سے کاپی نکال کر اپنا فون نمبر لکھا لیکن اپنا نام نہیں لکھا، شاپر پکڑ کہ اور اس چٹ کو ہتھیلی میں زور سے پکڑ کر میں کمرے سے نکلی اماں میں صابرہ بھابھی سے قمیض پر لیس لگوانے جا رہی ہوں نہ ان کے پاس ٹائم ہوگا نہ میرے پاس میں اماں کی بات سننے سے پہلے نکلنا چاہتی تھی۔ ارے رک جا ذرا، دیگچی مانجھ دے میں نے ہانڈی چڑھانی ہے میرے ہاتھ میں سخت درد ہے برتن نہیں دھوئے جا رہے اماں آ کر دھوتی ہوں اماں کی بات ادھ سنی کر کے میں ڈیوڑھی میں آ گئی۔ جالی کے دروازے سے باہر جھانکا تو دیکھا گلی میں خوب چہل پہل تھی چھتوں پر بسنت کی رات کو منانے کے لیے بڑی لائٹیں اور سرچ لائٹیں لگی تھیں۔ لڑکے ڈوریں اور گڈے لیے موٹر سائیکلوں پر جا رہے تھے میں نے دوبارہ باہر جھانکا تو گویا مجھے سو واٹ کا کرنٹ ہی لگ گیا میرے ابا اور چاچا نا جانے کہاں سے نمودار ہو گئے تھے اور چلتے آ رہے تھے اور پھر گھر کے دروازے پر آ کھڑے ہو گئے دونوں نہ جانے کون سی باتیں کر رہے تھے، میں شاپر پکڑے وہی جالی کے دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی اور پھر یاد آیا بھی مغرب کی اذان ہو گی تو یہ دونوں ممبر چلے جائیں گے اور میں باہر نکل کر وہ چٹ پھینک دوں گی اور وہ اُٹھا لے گا اور میں بھابی صابرہ کے گھر چلی جاؤں گی میں نے سارا پلان بنا لیا۔ ابا اور چاچا گھر کے باہر ایک بڑی لائیٹ لگوا رہے تھے لڑکا ساتھ لائے تھے اور اسی لیے باہر کھڑے تھے۔ لو مارے گئے اتنی بڑی لائٹ اب تو گلی میں پڑی سوئی بھی نظر آئے گی آج تو میری خیر نہیں۔ گلی دو منٹ میں ہی چم چم کر اُٹھی۔ بس اذان ہونے ہی والی تھی لیکن اس سے پہلے میں نے دیکھا گلی کے نکڑ سے وہ مڑا اور ہماری گلی میں آنے لگا، ہی لمبا قد لمبے لمبے بال، گلابی ٹی شرٹ اور جینز، شام ڈھلے بھی کالا چشمہ لگا رکھا تھا وہ چلتا آ رہا تھا اور ابا اور چاچا دروازے کے باہر بڑے مطمین انداز میں کھڑے تھے۔ لو جی آج تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب وہ ہمارے گھر کا ہی دیدار کر کے گزر جائے گا۔ شاید دروازے کی جالی کے اس پر میں اس کو نظر آ جاؤں لیکن یہ کیا وہ تو سیدھا ہمارے گھر کی جانب آنے لگا۔ ارے اللہ کے بندے پاگل ہو گیا ہے میں تو مر گئی اف۔ دروازے کی اوٹ میں ہو گئی اور سیدھا چلتا آیا اور ہمارے دروازے کے باہر کھڑا ہو گیا۔ میرا تو حلق ہی خشک ہو گیا۔ قریب تھا کہ پیچھے کی جانب بھاگ جاؤں لیکن ابا کی کھلی ہوئی بازو دیکھ کر میں رک گئی وہ اس سے بغلگیر ہو رہے تھے اور اس کے بعد چاچا بھی۔ او شہزادے میرے یار بڑے دن بعد نظر آیا تو؟ ابا نے بڑے پیار سے اسے کہا۔ اس سے پہلے کے وہ جواب دیتا، چاچا بولے اُوئے اور اے کی تو گلابی شرٹ پہنی ہوئے اے؟

بڈھی گھوڑی لال لگام اوشرم کر یار میرے سے بھی پانچ سال بڑا ہے تو ابھی بھی تو یہ لمبی زلفیں خضاب سے رنگ کے منڈا کھنڈا بنا ہوا ہے، چاچا کے یہ الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے۔

ابا بولے او یار دل جوان ہونا چاہیے عمراں وچ کی رکھیا۔۔۔ اے او تو ساڈا یار ایں۔۔۔

ابا نے اس کے کندھے پر زور زور سے تھپکی دی وہ ابا کی جانب مڑا تو اس کا چہرہ بالکل میری جانب ہو گیا گلی کی تیز روشنی میں، میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس وقت مسجد سے اللہ اکبر کی صدا آئی۔

اور بے اختیار اسے دیکھ کر میرے منہ سے بھی اللہ اکبر ایک چیخ کی سی آواز میں نکلی اور میں الٹے قدموں سے پیچھے کو بھاگنے لگی۔ بھائی پیچھے سے آ رہا تھا اور بُری طرح میرے سے ٹکرایا اور بولا اندھی ہو گئی ہے باولی نظر ٹیسٹ کرا جا کر۔

میں نے آہستہ سے کہا ہاں تم کہہ تو صحیح رہے ہو اور جلدی سے اندر کی طرف بھاگی شاپر پلنگ پر پھینکے ہوئے کچن کی طرف دھوڑتی وہ چٹ جلتے ہوئے چولہے میں جھونکتے ہوئے میں نے فوراً ہانڈی مانجھنے لگی۔

بقال وطوطی دوکاندار اور طوطا

حافظہ زینب خالد/ایم فل سکالر لاہور کالج یونیورسٹی

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ایک دوکاندار تھا اور اس کے پاس ایک طوطا تھا یہ طوطا خوبصورت اور اچھے آواز ہونے کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ عقلمند بھی تھا۔ اور جس وقت دکاندار دکان میں موجود نہ ہوتا تو وہ دکان کے گاہکوں کو پہچانتا اور ان سے سلام دعا کرتا اور ان سے حال چال پوچھتا۔دکان دار کو جب کوئی کام ہوتا تو وہ طوطے کو باندھتا اور اس کو دوکان پہ چھوڑ دیتا اور خود گھر چلا جاتا اور جب وہ لوٹتا تو وہ بتاتا کے جس وقت دوکان دار دوکان میں موجود نہیں تھا تو وہ اس وقت کسی شخص کو بھی دکان سے کچھ لے جانے نہیں دیتا۔اور جب کوئی آتا تو انہیں سلام کرتا اور کہتا صبر کریں۔ دوکان دار ابھی تھوری دیر تک واپس آ جائے گا۔ وہ لوگ جو اسے نہیں جانتے تھے۔جب اسے دیکھتے تو بہت حیران ہوتے اور اس کی مثال ایسی ہی ہوتی جیسے کوئی دکان دار کسی رکھوالے پاس سپرد کر دے اور لوگ دکاندار کے واپس آنے تک کا انتظار کرتے اور اگر اس آنے میں وقت ہوتا تو وہ واپس چلے جاتے۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ دکان میں ایک انجان بلی داخل ہوگئی۔اور جب اس نے ایک چوہے کی آواز سنی تو اس نے اس پر حملہ کر دیا اور طوطا جس نے بلی کو نہیں دیکھا تھا۔اور وہ اس حملے سے ناواقف تھا۔اور وہ اپنی جان کے خوف کے غرض سے کاؤنٹر سے ڈرتے ہوئے اڑا اس کی پاؤں کی بند سے تیل کی ایک بوتل گری اور سارا تیل گر گیا۔اور اڑتے ہوئے اپنے پنجرے میں بیٹھ گیا۔ بلی اس کے پیروں کی آواز سے ڈر گئی اور وہاں سے بھاگ گئی۔

جب دکاندار گھر سے لوٹا تو وہ دیکھ کر حیران ہوا اور اسے کچھ سمجھ نہیں آئی۔وہ بیٹھ گیا اس نے دیکھا کہ شیشہ ٹوٹا ہوا ہے اور تیل بکھرا ہوا ہے۔طوطے کے پروں پر بھی تیل ہے۔اس نے سوچا یہ سب طوطے نے کیا ہے۔اس نے طوطے کو پنجرے سے باہر نکالا اس کو غصے سے ڈانٹا اور اسے سزا دی اور اس سے کہا: تم بری آواز والے پرندے اور بُری حرکتوں والے پرندے ہو۔اور تم نے یہ کیا کام کیا ہے۔شیشہ کو توڑ کر اس میں سے سارا تیل گرا دیا ہے شیشے کو گرایا ہے۔اور اب تم اس کی سزا کاٹو گے۔اور اس کے ہاتھ میں لوہے کی کوئی چیز تھی۔ جسے اس نے غصے میں طوطے کے سر پر مارا اور اسے ایک طرف رکھا۔طوطا کا سر اس لوہے کی وجہ سے پھٹ گیا۔اور اس کے سر کی کھال وہاں سے نظر آنے لگی اس کے بعد دکاندار طوطے کو مارنے کی وجہ سے اپنی غلطی پر شرمندہ ہوا۔جبکہ طوطا جو کہ اپنے آپ کو بے قصور سمجھتا تھا۔

اس نے اپنے منہ سے ایک بھی آواز نہ نکالی۔ دکاندار نے طوطا کے سر کو صاف کیا اور اس کو دوائی لگائی۔اور کچھ عرصے بعد طوطا ٹھیک ہوگیا۔اور اس کے سر پر نئی کھال بھی آ گئی۔لیکن اس کے بعد سے طوطہ اپنے پنجرے میں بیٹھا رہتا تھا۔اور کوئی بات نہیں کرتا تھا۔جو کوئی بھی دکان میں آتا جاتا تھا۔وہ سب چاہتے تھے کہ وہ طوطے کی باتیں سنیں۔لیکن کوئی فائدہ نہیں تھا۔دکاندار جو کہ خود بھی طوطے کی اچھی باتوں کے ساتھ اپنا دل لگائے ہوئے تھا۔اور طوطا کو دوکان کی رونق سمجھتا تھا۔ وہ طوطے کو مارنے کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان ہوا لیکن طوطا بھی اپنی خاموشی کو شرم کے مارے توڑ نہیں پا رہا تھا۔اور بول نہیں رہا تھا۔

دکاندار کے دوست اُس سے پوچھنے لگے کہ طوطا کی باتیں کیوں نہیں کرتا ہے۔اور اس کے سر پر کیا ہوا ہے دوکاندار نے جواب دیا جب میں گھر سے لوٹا تو اس نے سارا تیل گرا دیا۔شیشے کو بھی توڑ دیا تھا۔ مجھے بھی غصہ آیا اور میں نے لوہا اٹھا کر اس کے سر پر مار دیا اور یہ سب ہوا۔ لیکن اب اس کا سر تو ٹھیک ہو گیا ہے۔لیکن اس کی زبان بند ہوگی ہے

بہت عرصہ گزر گیا اور طوطا کچھ نہ بولا۔اور اس کے بعد دکاندار نے شیشے کے ٹوٹنے اور تیل کے گرنے کی داستان لوگوں کو سنا دی تھی۔اسے طوطے کو یاد تھا جب شیشہ ٹوٹتا تھا تو اس سے تیل گرا تھا وہ گیا اور شیشے کے سامنے جا کر بیٹھ گیا اور اس نے اپنے سر کو دیکھا اس نے دیکھا کہ اس کے سر پر کوئی بال نہیں ہے۔ اسے یاد تھا کہ ہاں شیشہ ٹوٹا تھا اور وہ اب ایک لفظ نہیں بولتا تھا۔دکاندار صرف اس غرض سے کس کا طوطا دوبارہ سے باتیں کرے۔ وہ لوگوں سے زیادہ باتیں کرتا تھا اور وہ طوطے کی اچھائیاں اور اس کی باتیں ان سے کہتا تھا۔

اس کی ان سب کوششوں کا کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔اور طوطا جانتا تھا کہ شیشہ ٹوٹا تھا اور اس کا سر کیسے زخمی ہوا تھا اور وہ جو ہے اب بہتر ہے اور اب وہ

چپ رہا۔ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک روز دکاندار کے چند ملنے والے دکان میں جمع ہوئے۔ اور انہیں ہر طرح کے موضوع پر باتیں کرنا شروع کی۔ اور ان لوگوں میں سے ایک جو وہاں پر موجود تھا۔ اس کے سر پر بال نہیں تھے۔ وہ گنجا تھا بال نہیں تھے۔ ان میں موجود ایک شخص نے بولا میں انہیں جانتا ہوں، جب وہ چلے گئے تو کہنے لگا کہ بہت سال پہلے ان کے سر پر بال تھے اب پتہ نہیں وہ کیوں گنجے ہیں۔ اس وقت اچانک طوطے نے بولنا شروع کر دیا۔

اور اس نے کہا میں جانتا ہوں۔ شیشے کو توڑا اور تیل گر گیا اور اس کے بعد سے یہ گنجا ہو گیا۔ اور لوگ جو اس وقت وہاں پر جمع تھے اس کی بات سن کر ہنس پڑے۔ کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ طوطے نے صرف اس بات کی فکر کی۔ کہ اس آدمی کی طرح اس کے سر پر بال نہیں ہیں دوکاندار طوطے کے بولنے سے خوش ہو گیا اور کہنے لگا۔ طوطا کی یہ بات ہمیں بہت بڑا سبق دیتی ہے۔

ہم بھی اپنے کاموں میں کچھ ایسے قیاس کر لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی ایک شخص جو کسی برے کام میں (مصیبت میں) ہوتا ہے۔ اس نے کوئی برا کام کیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہم یہ خیال کر لیتے ہیں کہ جو کوئی بھی کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ گرفتار ہو جاتا ہے۔

اگر اس کے برعکس کوئی بے گناہ شخص گرفتار ہو جاتا ہے تو ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ جو شخص گرفتار ہوا ہے وہ بے گناہ ہے۔ جب کہ ہم کسی کے بارے میں نہیں جانتے ہیں۔ ہمیں کسی کے بارے میں کسی قسم کا کوئی قیاس یا کوئی خیال نہیں کرنا چاہیے۔

اپنے جسم کو پیڑ بنایا کرتے تھے
دھوپ نگر کے لوگ بھی سایا کرتے تھے
اب نادانی کے آنسو کیوں روتے ہو
تم پانی پہ سنگ اُٹھایا کرتے تھے
وہ بھی دُکھ میں ضبط سے یاری رکھتا تھا
ہم بھی اپنے زخم چھپایا کرتے تھے
یاد کرو ان چھاگل والے لوگوں کو
صحراؤں میں پھول اُگایا کرتے تھے
تجھ میں اک تقسیم کی خُو بھی ہوتی تھی
لوگ تری دہلیز پہ آیا کرتے تھے
رنگ دھنک کے لے کر اُس کی آنکھوں سے
پانی پر تصویر بنایا کرتے تھے
بچوں جیسے تھے جذبات ہمارے بھی
گھر آنگن میں شور مچایا کرتے تھے
شکر بجا لاتے تھے ایک نوالے پر
رُوکھی سُوکھی روٹی کھایا کرتے تھے

نوید مرزا/لاہور

گزرتا وقت ہی اس راز سے پردہ اُٹھائے گا
ہمیشہ یاد رکھے گا وہ یا پھر بھول جائے گا
کسے معلوم تھا دل یہ کرامت بھی دکھائے گا
جو آنکھوں میں نہیں آتا وہ چہرہ دل میں آئے گا
یہاں روزی کمانے کے لیے کتنی مسافت ہے
تمھیں یہ دکھ غبارے بیچنے والا بتائے گا
دعا کرنا کہ منجدھاروں میں وہ کندھے سلامت ہوں
جہاں چپو نہیں چلتا وہاں بازو چلائے گا
ابھی واپس پلٹ جاؤ تمھارے حق میں بہتر ہے
وگرنہ یہ جنوں اک ن تمھیں دردر پھرائے گا
مجھے مجنوں نے صحرا کی یہ خاصیت بتائی تھی
یہاں طوفان پانی سے نہیں آندھی سے آئے گا

وجاہت تبسم/گجرات

چرخِ سرخ

دیکھو اے لوگو
یہ سہما ہوا آسمان تم بھی دیکھو
لبادۂ قرمز اوڑھے، وحشت زدہ آسمان تم بھی دیکھو
چمکتے ستارے تو دیکھے ہیں تم نے
رُت بادلوں کی بھی پہچانتے ہو تم
چرخِ آبی کے حسن سے واقف بھی ہو تم
مگر اے زمین زادو! ہم وطن ہمارے
آج ذرا یہ منظر بھی دیکھو
یہ شامِ غریباں کے رنگوں میں ڈوبا
یہ مسکن ہمارا
یہ گردن پہ خنجر، یہ وحشت کہ منظر
یہ شہر ہمارا، یہ کیسا وطن ہے
یہ مسکن بنا سرد خانہ ہمارا
یہ شہر ہمارا یہ کیسا شہر ہے
کاشانہ بنا قفس اب ہمارا
یہاں کی زمین پر شکایت پہ قدغن
شہر تو کیا ہے، سراپا ہے مدفن
گو قیامت نہ گزری زمین باسیوں پر
دہل ہاں گیا گردوں اس جبر پر
اے لوگو! ذرا یہ منظر بھی دیکھو
یہ شامِ غریباں کے رنگوں میں ڈوبا
یہ شہر ہمارا
سرد خانہ ہمارا
قفس یہ ہمارا
شالکوٹ ہمارا
مدفن ہمارا

اقصیٰ غرشین/کوئٹہ

میں دوسرے شہروں کے بارے میں تو اتنا نہیں جانتی لیکن بچپن سے اب تک شہر کوئٹہ جب بھی خون میں نہلایا ہے، آسمان نے سرخی کی چادر اوڑھ لی ہے۔ دل غم سے پھٹنے لگتا ہے تو چرخِ آبی اپنے تئیں دلاسہ دیتا ہے شاید۔ تصاویر تین دن قبل ہماری ہمشیرہ نے بغیر کسی فلٹر کے لی ہیں۔
شالکوٹ: کوئٹہ شہر کا قدیم نام

فرحانہ عنبر/گوجرانوالہ

گوجرانوالہ جہاں پہلوانوں کا شہر مشہور ہے وہاں علمی وادبی حوالے سے بھی گوجرانوالہ کی زمین بڑی زرخیز ہے۔ جہاں ادب کے اُفق پر کئی نامور ستارے چمکے جن کی روشنی پاکستان کے علاوہ پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ فرحانہ عنبر بھی اُسی قبیلے کی ایک فرد ہے جو اپنی خوبصورت شاعری سے خود کو ادبی حلقوں میں منوا چکی ہے۔ وہ شاعری کے ذریعے محبت کشید کرتی ہے اور پھر اُسے آگے تقسیم کرتی ہے۔ اُس کی شاعری میں حسن کائنات اور حسن رات کے تمام رنگ موجود ہیں۔ وہ محبت جیسے لطیف جذبوں کو بڑے احسن طریقے سے اپنی شاعری میں بیان کرتی نظر آتی ہے۔ فرحانہ عنبر سائبان کے نام سے ایک فلاحی تنظیم کی بڑی سرگرم رکن ہیں جن سے ان کی سماجی حیثیت بھی بڑی کھل کر سامنے آتی ہے۔

اندیشہ

سنو اے زندگی!
ٹھہرو
وہ مجھ سے ملنے آیا ہے
میرے اندر بہت سی ان کہی پیاسی تمناؤں نے
پھر سے سر اُٹھایا ہے
بے کس یادوں کے ساحل پر پڑی کچھ سیپیوں کو
میں نے کتنے پیار سے
چاہت کی ڈوری میں پرویا ہے
یہ ڈوری ٹوٹ نہ جائے
وہ مجھ سے روٹھ نہ جائے
میرے ہاتھوں سے دامن عشق کا پھر چھوٹ نہ جائے
دھنک رنگی فضاؤں سے اُترتی
دل دریچے پہ صدا دیتی وہی مانوس سی آواز پر دل
کھنچا جاتا ہے
کہیں وہ لوٹ نہ جائے
یہ سپنا ٹوٹ نہ جائے
سنو اے زندگی ٹھہرو
وہ مجھ سے ملنے آیا ہے

دشت سخن میں راستے کھلتے چلے گئے
جب ہم چلے تو کارواں بنتے چلے گئے
کب زندگی ہمارے لیے دل فریب تھی
اک بازگشت تھی جسے سنتے چلے گئے
کچے گھڑے کا ساتھ گوارہ نہیں کیا
موجوں کے ساتھ ساتھ ہی بہتے چلے گئے
تھاما جو تو نے ہاتھ رہ خاردار میں
لاکھوں گلاب راہ میں کھلتے چلے گئے
ہم لوگ تھے خزاں میں گرے پات کی طرح
آئی ہوا تو ساتھ ہی اُڑتے چلے گئے

جو آنکھیں بند کر لیں تو نظارہ خوب ہوتا ہے
ہم ایسے عاشقوں کا یوں گزارا خوب ہوتا ہے
شرارت پر جو آ جائے تو کب رُکتا ہے دل ان کا
نگاہوں ہی نگاہوں میں اشارہ خوب ہوتا ہے
مری ویران راتوں کے فلک پر جھلملاتا سا
سنا ہے آپ کے جیسا ستارہ خوب ہوتا ہے
جہاں بے لوث جذبوں میں ذرا بھی کھوٹ آ جائے
تو ایسے ملنے جلنے سے کنارہ خوب ہوتا ہے
محبت کے تسلسل میں کچھ ایسے موڑ آتے ہیں
جہاں ہر گام پہ خود کو پکارا خوب ہوتا ہے

گلشن زیست میں وحشت کا ٹھکانہ چاہیں
خشک پتے ہیں بکھرنے کا بہانہ چاہیں
ہم نے دنیا سے کنارا تو کیا ہے لیکن
ضد پہ آ جائیں تو قدموں میں زمانہ چاہیں
گردش وقت نے روکا ہے وگرنہ اے دل
ہم تو ہر عہد محبت میں نبھانا چاہیں
جس کی تعبیر مکمل ہو ہمارے دم سے
تیری راتوں سے وہی خواب چرانا چاہیں
حاصلِ عشق تیری خیر مگر کیا کہیے
لوگ دو وقت کی روٹی تو کمانا چاہیں

ناز و انداز سے سنوارا گیا
چاک سے جب مجھے اُتارا گیا
عشق کے لازوال رنگوں سے
حسن بے تاب کو نکھارا گیا
وصل کے جاں گداز لمحوں کو
آتش ہجر سے گزارا گیا
زندگی تیرے ساتھ چلنے کو
نت نیا روپ کوئی دھارا گیا
اس کی تصویر کھو گئی مجھ سے
ہائے اک آخری سہارا گیا
عشق کو آگہی ملی عنبر
جلتے شعلوں میں جب اُتارا گیا

ہم بدلتے رہے راستے عمر بھر
کم ہوئے نہ کبھی فاصلے عمر بھر
اصل چہرہ نہ ہم کو دکھائی دیا
گرچہ دیکھا کیے آئینے عمر بھر
مات کھاتے رہے اپنی قسمت سے ہم
وقت دیتا رہا حوصلے عمر بھر

شازیہ رباب/ملتان

قدیم شہروں کے دائمی دُکھ

قدیم شہر جب پلٹ کر دیکھتے ہیں
تو دیکھتے ہیں کتنے ہرے بھرے تھے
لوگ توانا، جوان اور مست
اپنے کاموں میں لگے تھے
ان کے گھروں کا بٹوارا نہیں تھا
سبھی کے دل سب سے جڑے تھے
قدیم شہر حسین یوں تھے
کہ بام و در گر کھلے بھی رکھتے
تو عزتوں پر نہ حرف آتے
پیام امن بسائے دل میں
لوگ زندگی بتائے جاتے
اپنے دل میں احساس اُلفت بسائے جاتے
قدیم شہر اپنے ورق پلٹیں تو دیکھتے ہیں
محبتیں تو اُجڑ چکی ہیں، لہولہو ہیں
پگڑیوں کی لاج رکھنے میں لٹ چکی ہیں
وہ شوخ لہجے بیوگی میں ڈھل چکے ہیں
بوڑھے رعشہ زدہ سے ہاتھ کسی دستک کے منتظر ہیں
بینائی کھو کر بہت سی آنکھیں کسی لمس کو ڈھونڈتی ہیں
قدیم شہر پیچھے ہٹ کر کبھی جو دیکھیں
تو دیکھتے ہیں کہ کچی مٹی کی وہ دیواریں
اب بھی اپنی جگہ کھڑی ہیں
جیسے زبان خامشی میں یہ کہہ رہی ہوں
کہ ہم وفا میں بے مثل یوں ہیں
ہمارے اندر ہی بسنے والے چھوڑ کر ہم کو جا چکے ہیں
مگر ہم اپنی جگہ پہ قائم ہیں منتظر ہیں
قدیم شہر اپنی نوکے جب شہر ہیں
وفائیں گروی رکھ کے لوگ اپنی زندگی گزارتے ہیں
طاقوں میں رکھے چراغ مدت سے بجھ چکے ہیں
رسوئی میں رکھے مٹی کے برتن
دھول مٹی میں اٹ چکے ہیں
کسی فریم میں لگی تصویر بے دلی سے مسکراتی ہے
قدیم شہر اپنی روایات پر آج بھی ڈٹے ہیں
ایک دسترخوان آج بھی چنا جاتا ہے
جہاں غم، تشنگی، پچھتاوے، ہجر اور دکھ چنے جاتے ہیں
منجمد لب، اُداس آنکھیں، ٹوٹے دل، گھٹی گھٹی سسکیاں
سب دسترخوان کی چاروں طرف آ کر بیٹھتے ہیں
نظر جھکا کر اپنے حصے کا تبرک لیے اُٹھ جاتے ہیں
قدیم شہروں کی خامشی کو غور سے سننا پڑتا ہے
حقے خاموش ہیں مگر آج بھی گڑگڑاتے ہیں
آج بھی کہیں یاروں کی بیٹھک سجائی جاتی ہے
پرانے دوست احباب بوسیدہ چارپائیوں پر
پرانے تکیوں کی ٹیک لگا کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں
منتظر ہیں کہ کون ازلی خامشی کا پردہ چاک کرتا ہے
قدیم شہر اپنی بے بسی پر کبھی چپکے سے آنسو بہاتے ہیں
وہ لمحے یاد کرتے ہیں کہ جب ساون برستا تھا
تو شوخ تتلیاں رنگین چنریاں اوڑھے
گھروں کے صحنوں میں بارش کا لطف لیتی تھیں
بھیگے بدن کو چنری سے ڈھانپ کر
خود شرما سی جاتی تھیں نظریں جھکاتی تھیں
مگر کوئی میلی نگاہ ان کی جانب نہیں اُٹھتی تھی
قدیم شہر قدیم رسموں کی آماجگاہ ہیں
جب محبت کرنے والے دل پنچایت میں بلائے جاتے ہیں
ان کے دل میں جھانکے بغیر قاضی فیصلہ سناتا ہے
انہیں سنگسار کرنے کا جو حکم دیا جاتا ہے
کئی ہاتھ پتھروں کی طرف بڑھتے ہیں
محبت بے بسی سے نظریں جھکائے رکھتی ہے
قدیم شہروں کے دکھ بھی قدیم ہوتے ہیں
وقت دبے پاؤں بہت کچھ روند کر نکل جاتا ہے
تو شہر کی گلیاں تاریکی میں کھڑے ماضی کو آواز دیتی ہیں
ہنستے کھیلتے بچوں کے شرارتی قہقہے
کانوں میں گونج اُٹھتے ہیں تو بوڑھی دیواریں لرز جاتی ہیں
کبھی چوڑیوں کی نازک کھنک دل پر وار کرتی ہے
کبھی وہ لوگ یاد آتے ہیں کہ جو جینے کی چاہت میں
موت کی وادیوں میں اُتر بیٹھے ہیں
کبھی وہ ریشمی آنچل ہوا میں لہراتا نظر آتا ہے
کبھی سہاگنوں کے ملن کے گیت سنائی دیتے ہیں
کبھی محبتوں میں ہجر کہرام مچاتا ہے
کبھی بوڑھی نابینا مائیں بینوں کا بین کرتی ہیں
کبھی ناتواں کندھے کفاروں کا بوجھ ڈھوتے ہیں
قدیم شہر کی یہ بھی رسم پرانی ہے
کہ دنیا ختم ہونے سے بہت پہلے
لوگ زندگی ہار جاتے ہیں
مر جاتے ہیں

قندیل بدر/کوئٹہ

سرگوشی

چپ کے دریا میں کوئی کنکر گرا
روشنی پھوٹی
فلک کے پار اک کھڑکی کھلی
سرسراہٹ سی کوئی وادی کے پہلو میں ہوئی
چاند کے ہالے میں لہریں تھرتھرانے سی لگیں
جھیل کے دامن میں ٹھنڈی آہ کشتی نے بھری
بادلوں میں جیسے آتش بازیاں ہونے لگیں
پیڑ گم سم راستوں پر کروٹیں لینے لگے
پربتوں کو کون ایسے گدگدی کرنے لگا
یہ فضا میں مارواکا راگ کیوں بجنے لگا
وقت کا پہیہ بگولی رقص کیوں کرنے لگا

اشش چپ!!

پھر سے سرگوشی ہوئی
اور سارے منظر جم گئے
رات نے دم سادھ لی
لو روشنی بھی سو گئی

جگ کی ریت نرالی ہے
جھولی بالکل خالی ہے
میرے بادل ہاتھوں میں
سرخ شفق کی تھالی ہے
آنکھوں کے سونے بن میں
اب بھی کچھ ہریالی ہے
اس نیلے چھت کے آگے
ایک سنہری جالی ہے
میرے لیے تیری دنیا
بس چائے کی پیالی ہے
آنکھوں کے بہلانے کو
تتلی میں نے پالی ہے
آ جا سبی جنکشن پر
گاڑی چلنے والی ہے
تو نے کہا تھا چاند نہیں
تیرے کان کی بالی ہے
پورا قصہ لکھا پر
اصلی بات چھپا لی ہے
آج اپنے کالے تن پر
خود ہی مٹی ڈالی ہے
بارش ہو گئی تیز بہت
بجلی جانے والی ہے

آنچل بادل کا اوڑھا ہے پائل بارش کی پہنی
آج مجھے کوئی بھی دیکھے آج ہوں میں اتنی اُجلی
میں مٹی کی کوکھ سے جنمی پھر مٹی مٹی کھیلی
مٹی سے ممتا سیکھی ہے مٹی سے ہی گود بھری
میری سوچیں بھی بادل ہیں میری آنکھیں بھی بادل
میرا درپن بھی بادل ہے کیا میں ہوں بادل جیسی
لہک لہک کر بول رہی ہے خوشبو میرے بالوں سے
تو اس رستے سے گزرا ہے ہوا چلے مہکی مہکی
تو نے شاید دیکھے ہوں گے کرچے خالی شیشوں کے
میری آنکھوں نے دیکھے ہیں پتھر بھی کرچی کرچی

محمد امین ساجد سعیدی کی اُردو نعتیہ شاعری کا
تحقیقی وتنقیدی جائزہ
مقالہ نگار: نیاز احمد
لاہور لیڈز یونیورسٹی، لاہور
جلد کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے

فروغِ ادب کے لیے وقف
براہ کرم اپنی اردو اور انگریزی تخلیقات (شاعری ونثر)
کمپوز کروا کے "ان پیج" میں ای میل کر دیا کریں
bookdigest@hotmail.com
آپ اپنے مضامین بذریعہ ڈاک بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ رسالے کے حصول کے لیے سالانہ زرِ تعاون مبلغ/-1000 روپے اپنے ڈاک کے پتے اور موبائل نمبر کے ساتھ بذریعہ منی آرڈر بنام مظہر سلیم مجوکہ مدیر اعلیٰ ماہنامہ بک ڈائجسٹ، کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور کو ارسال کریں۔ رسالہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔
بک ڈائجسٹ
برائے خط کتابت/ ترسیل زر / رابطہ
کتاب ورثہ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
0333-4377794-042-37322996
بہ یاد: سید قاسم محمود
Monthly Book Digest
بک ڈائجسٹ لاہور
ISSN 2079-4584
bookdigest@hotmail.com
kitabvirsa@gmail.com
مدیر اعلا: مظہر سلیم مجوکہ
مدیر اعزازی: اظہر سلیم مجوکہ
صوبہ پنجاب کے تمام کالجوں اور پبلک لائبریریوں کے لیے منظور شدہ

انٹرویو: ناصر بشیر

س ناصر بھائی! سب سے پہلے اپنے سوانحی و ادبی پس منظر کے بارے میں آگاہی دیجیے۔

ج میں ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو (آج سے باون سال پہلے) ملتان میں اپنے ننھیال میں پیدا ہوا۔ میرا ددھیالی شہر لائل پور تھا جو اب فیصل آباد کہلاتا ہے۔ والد گرامی بشیر احمد راٹھور لکھنے پڑھنے والے آدمی ہیں۔ انھوں نے کتابیں جمع کرنے کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ میری والدہ مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ اگر تمھارے ابو ہر روز دو تین کتابیں لانے کے بجائے ہر روز ایک اینٹ خریدتے تو آج ہمارا بھی ایک ذاتی مکان ہوتا۔ آپ سن کر حیران ہوں گے ہمارا پورا خاندان آج بھی کرائے کے مکان میں مقیم ہے۔ والد صاحب بھی کرائے کے مکان میں رہتے ہیں اور میں بھی۔ اس کے باوجود اپنے وطن سے ہماری محبت ہر روز دوچند ہو جاتی ہے۔ میری پہچان پاکستان سے ہے اور الحمدللہ میرے پاکستانی کی شعری و ادبی شناخت میں ہوں۔ مجھے دنیا بھر میں ایک پاکستانی شاعر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ محترم مجیب الرحمٰن شامی تو مجھے ''شاعرِ پاکستان'' کا خطاب دے چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری غزل آج کے پاکستان کی تخلیقی گواہی ہے۔ میں خود کو مولانا الطاف حسین حالی، اکبر الٰہ آبادی، اقبال، ظفر علی خاں، فیض احمد فیض، احمد فراز اور حبیب جالب کا مقلد سمجھتا ہوں۔ مقلدی شاعری کو تخلیق کا مرتبہ دینا کوئی ان شاعروں سے سیکھے۔ کم از کم میں نے تو سیکھ لیا ہے۔

بچپن کتابوں میں گزرا۔ اس لیے صحافت اور شعر و ادب ہی کی طرف آنا تھا۔ ملتان میں زمانہ طالب علمی ہی میں روزنامہ ''امروز'' اور روزنامہ ''نوائے وقت'' میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ میرا چھٹی جماعت کا ایک کلاس فیلو مئی کی شدید گرمی میں عام خاص باغ ملتان فٹ بال کھیلتے ہوئے انتقال کر گیا تو میں نے پورے واقعے کی خبر بنائی اور روزنامہ ''امروز'' کے دفتر میں مرزا ابن حفیظ اور ولی محمد واحد کے پاس لے گیا۔ میری بنائی ہوئی خبر دیکھتے ہی دونوں بے ساختہ بولے ''بھئی یہ تو بہت اچھی خبر ہے'' میں سن کر حیرت میں پڑ گیا کہ جو خبر گھر والوں پر بجلی بن کر گری ہے اخبار والوں کے لیے وہ بہت اچھی خبر ہے۔ اسی دن مجھے پتا چل گیا تھا کہ میرے اندر ایک خبر نگار، صحافی موجود ہے۔ شاعری کا جوہر بھی بچپن سے میرے اندر موجود تھا۔ ساتویں آٹھویں جماعت میں تھا جب میری ٹوٹی پھوٹی شاعری ملتان کے مقامی اخبارات میں چھپی تھی۔ ۱۹۸۵ء میں انٹر کرنے کے لیے گورنمنٹ کالج سول لائنز ملتان گیا تو وہاں انور جمال جیسے ذہین استاد اور نہایت عمدہ شاعر سے اردو لازمی اور اردو اعلیٰ پڑھی۔ انہوں نے میری شاعری کے جوہر کو پہچان لیا تھا۔ سو مجھ پر کچھ زیادہ ہی توجہ دیتے تھے۔ ۱۹۸۶ء میں اطہر ناسک میرے والد صاحب کے کہنے پر مجھے بیدل حیدری مرحوم کے پاس کبیر والہ لے گیا۔ میرے والد صاحب کی خواہش تھی کہ بیدل صاحب مجھے اپنے حلقہ تلامذہ میں شامل کر لیں۔ بیدل صاحب نے کہا کہ پہلے میں تمہارا امتحان لوں گا۔ اگر کامیاب ہو گئے تو ٹھیک ہے ورنہ گھر واپس چلے جانا۔ میں نے امتحان سے گزرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے کاغذ کے ٹکڑے پر ایک مصرع لکھا جو بے معنی سا تھا۔ وہ مصرع یہ تھا:

کہاں ہے، کہاں ہے، کہاں ہے ابھی

بولے ''اس مصرع کو بامعنی مصرع لگا کر مکمل شعر بنا دو۔'' ہاف سیٹ چائے آ چکی تھیں جس میں سے تین کپ بنا لیے گئے۔ ایک کپ مجھے تھما دیا اور کہا کہ ہم سے کچھ فاصلے پر بیٹھ جاؤ اور آدھے گھنٹے کے اندر گرہ لگاؤ۔ اتفاق دیکھیے کہ یہ مصرع دیکھتے ہی مجھے ایک مصرع سوجھ گیا۔ میں نے وہ بیدل صاحب کے مصرع کے نیچے لکھ دیا اور کاغذ کا ٹکڑا بیدل صاحب کے سامنے دھر دیا۔ کاغذ دیکھ کر انھوں نے پریشانی کے عالم میں اپنے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ لیا۔ ناسک نے دیکھا تو بولا ''بیدل صاحب! ابھی بچہ ہے۔ ایک موقع اور دے دیجیے۔'' بیدل صاحب بولے ''نہیں بھئی! اس کا لگایا ہوا مصرع دیکھو'' جب بیدل صاحب نے میرا مصرع سنا تو ناسک نے بھی خوب داد دی۔ مصرع لگانے کے بعد شعر یوں مکمل ہوا تھا:

کہاں ہے، کہاں ہے، کہاں ہے ابھی
یہ دنیا جہاں تھی وہاں ہے ابھی

اطہر ناسک نے میرے بازو پر رومال باندھا۔ پاؤ بھر برفی منگوائی گئی جو ہم تینوں نے مل کر کھائی۔ دوبارہ چائے پی گئی۔ یہ تھی میرے استادِ گرامی کی رسم شاگردی

بی اے میں نے گورنمنٹ ایمرسن کالج سے کیا۔ پروفیسر افتخار حسین شاہ سے اردو زبان و ادب کا اختیاری مضمون پڑھا۔ عامر سہیل میرا کلاس فیلو تھا جو آج خود پی ایچ ڈی ہے اور سینکڑوں شاگردوں کو ایم

فل اور پی ایچ ڈی کرا چکا ہے۔

یہ بات آپ کے لیے شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ میٹرک کے بعد میرے والد نے مجھے ریلوے روڈ ملتان کے ایک موٹر سائیکل مکینک کے پاس کام سیکھنے کے لیے بٹھا دیا تھا لیکن رزلٹ آیا تو میری فسٹ ڈویژن تھی۔ سو مجھے انٹر میں داخلہ دلوا دیا گیا۔ انٹر کے امتحان کے بعد مجھے والد صاحب نے وہاڑی روڈ کی ایک مشہور ٹیکسٹائل ملز میں بھرتی کرا دیا لیکن رزلٹ ایک بار پھر اچھا آیا۔ اس لیے بی اے میں داخل کرا دیا گیا۔ بی اے کے بعد والد صاحب نے پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ تعلیم کا سلسلہ موقوف کر کے مجھے کسی کام پر لگوا دیں گے لیکن میں نے بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں داخلے کی درخواست دے دی۔ صدر شعبہ ڈاکٹر انور احمد شاید میرے والد صاحب سے ملے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے ایم اے اردو میں داخلہ نہیں دیا۔ میں غالباً ان کے میرٹ پر پورا نہیں اُترتا تھا۔ ان کا میرٹ کیا تھا۔ ساری دنیا جانتی ہے۔ تبھی تو پنجاب کے ایک گورنر خالد مقبول نے انھیں سرائیکی کا ڈیپارٹمنٹ بنا کر دے دیا تھا۔ بی ایڈ یو کے رجسٹرار عرش صدیقی صاحب نے مجھے کھڑے پیر این او سی بنا کر دیا اور کہا پنجاب یونیورسٹی یا گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لو۔ لاہور میں رہو گے تو دیکھنا جو لوگ آج تمھیں ایم اے میں داخلہ نہیں دے رہے کل تمھیں حیرت سے دیکھا کریں گے۔ مجھے انوار صاحب سے آج کوئی گلہ نہیں۔ میں آج بھی ان کا احترام اسی طرح کرتا ہوں جیسے کل کرتا تھا۔ سبب اس کا یہ ہے کہ وہ میرے لاتعداد دوستوں کے اُستاد ہیں۔ آج الحمدللہ میری شاعری پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی میٹرک کی اردو کی کتاب میں شامل ہے۔ ہم نے تو یہ سنا تھا کہ میٹرک اور انٹر میں صرف انھی شاعروں کی نظمیں شامل ہوتی ہیں جنھیں مرے ہوئے چالیس پچاس برس گزر چکے ہوں۔

س میٹرک کی کتاب میں آپ کی کون سی نظم شامل ہے؟

ج اس نظم کا عنوان ہے ''بہادر بچے'' اس کا مطلع ہے:

پاکستانی بچے ہیں ہم، امن سے اتنا پیار ہمیں
اپنے اندر کے دشمن سے لڑنا ہے اس بار ہمیں

یہ نظم میں نے سانحہ پشاور کے پس منظر میں لکھی تھی۔ میرے تین بچوں نے میٹرک میں یہ نظم پڑھی ہے۔ چوتھا شاید اگلے سال پڑھے۔

س پھر آپ نے ایم اے اُردو کہاں سے کیا؟

ج فیصل آباد کی پہچان ڈاکٹر ریاض مجید صاحب نے مجھے لاہور جاتے ہوئے فیصل آباد ہی میں روک لیا۔ گورنمنٹ کالج دھوبی گھاٹ میں ایم اے میں داخلہ بھی دلوا دیا اور روزنامہ ''عوام'' میں اٹھارہ سو روپے ماہوار پر ملازمت بھی دلوا دی۔ یہ ۱۹۸۸ کی بات ہے۔ اٹھارہ سو روپوں میں سے ایک ہزار روپے کی بچت کر کے گھر بھیجتا رہا۔ ''عوام'' اخبار نے میری صحافتی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ روزانہ کسی مقامی موضوع پر اداریہ لکھنے سے میری قوتِ تحریر بے پناہ ہو گئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ کاغذ اور قلم سے جتنا میرا رشتہ ہے شاید ہی کسی کا ہو۔ ہر روز کچھ نا کچھ لکھتا ہوں۔ غزلیں کہتا ہوں۔ نظمیں لکھتا ہوں۔ اخبار کے لیے کالم نویسی کرتا ہوں۔ کتابوں پر تبصرے کرتا ہوں۔ لوگوں کے انٹرویوز کرتا ہوں۔ حتیٰ کہ بہت سا کام میں دوسروں کے لیے بھی کرتا ہوں۔ مجھے آپ سخن مزدور یا قلم مزدور کہہ سکتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو اصلاح کے نام پر غزلیں لکھ کر دیتا ہوں۔ روزی روٹی کے لیے یہ سب کرنا پڑتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی ضرورتیں بہت کچھ کراتی ہیں۔

س پھر لاہور کس طرح آئے؟

ج ۱۹۹۰ء میں ایم اے فائنل ایئر کے پیپر دے کر میں لاہور آ گیا۔ یہاں آتے ہی روزنامہ ''پاکستان'' میں ملازمت مل گئی۔ ان دنوں یہ اخبار نیا نیا نکلا تھا۔ پاکستان میں میں نے بہت بڑے بڑے صحافیوں کو قریب سے دیکھا۔ ان کے ساتھ کام کیا۔ یہ یادداشتیں کبھی ضرور لکھوں گا۔

س درس و تدریس کی طرف کیسے آئے؟

ج مجھے شروع ہی سے لیکچرار بننے کا شوق تھا۔ تبھی تو ایم اے اردو کیا تھا۔ ایم اے کرنے کے پانچ برس بعد ۱۹۹۵ء میں مجھے پنجاب پبلک سروس کمیشن نے لیکچرار سلیکٹ کیا۔ پہلی پوسٹنگ پتوکی میں ہوئی۔ ڈاکٹر اجمل نیازی ان دنوں روزنامہ ''پاکستان'' میں میرے رفیقِ کار تھے۔ ایک دن کہنے لگے: ''یار! کاج دے منڈے تیرے کولوں ڈر جاندے نیں؟'' میں نے کہا ''ڈاکٹر صاحب! میں منڈیاں نوں پڑھان جاناں واں ڈران نئیں جاندا'' اس پر انھوں نے بھرپور قہقہہ لگایا اور بولے ''یار! اسی تے اج تک نئیں پڑھایا۔ ساڈے کولوں تے پرنسپل وی ڈردا اے۔'' آج مجھے پڑھاتے ہوئے پچیس سال ہو گئے ہیں۔ ان دنوں گورنمنٹ دیال سنگھ کالج کے شعبہ اُردو سے وابستہ ہوں۔ ۲۰۲۸ء میں بشرطِ زندگی ''ساٹھ برس کی عمر میں سبک دوش ہو جاؤں گا اور نئے ارادوں کے ساتھ زندگی گزاروں گا۔

س آپ کی شاعری کے اب تک کتنے مجموعے چھپ چکے ہیں؟

ج آپ حیران ہوں گے کہ میرا اکلوتا شعری مجموعہ ''منظر بدل گئے'' 1994 میں چھپا تھا۔ آج 26 سال گزر گئے دوسرا مجموعہ نہیں چھپ سکا۔ شاعری کے انتخاب کا موقع ہی نہیں مل رہا۔ شاعری کروں یا کتاب مرتب کروں؟ اب سوچ رہا ہوں کہ 2021 میں شاعری کے دو ایک مجموعے لے ہی آؤں ''منظر بدل گئے'' اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوا تھا۔ اس پر احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد، ظفر اقبال، روحی کنجاہی، خالد احمد اور عباس تابش کی مختصر اور مفصل آرا درج تھیں۔ اس کتاب کی رونمائی شیزان ہوٹل میں قتیل شفائی کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی اس تقریب میں حامد میر نے اپنی زندگی کا پہلا اول مضمون پڑھا تھا جو بعد میں روزنامہ پاکستان میں ''قلم کمان'' کے عنوان سے کالم کی صورت میں چھپا تھا۔ گم شدہ افسانہ نگار شمس آغا پر میں نے ایم اے کا مقالہ لکھا تھا جو بعد میں ''شمس آغا کی کہانی'' کے نام سے کتابی صورت میں چھپا۔ 2006 میں ''اشفاق صاحب کے زاویے'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تو علامہ اقبال کے پوتے منیب اقبال کی طرف سے نوٹس آ گیا کہ اشفاق احمد کے بارے میں آپ کو کتاب چھپوانے کا کوئی قانونی حق نہیں۔ یہ کتاب بازار میں دستیاب ہے۔ میرے لئے اقبال سے یہی نسبت کافی ہے کہ مجھے اقبال کے پوتے نے قانونی نوٹس بھیجا۔ بعد میں ایک تقریب میں منیب اقبال نے مجھے شاعری پر ایوارڈ دیا۔

س اقبال کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ج اقبال شاعری کی وہ بلند چوٹی ہے جسے آج تک کوئی سر نہیں کر سکا۔ جو اس چوٹی کو سر کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ سد پارہ کی طرح گم ہو جاتا ہے۔ مجھے آپ اقبال کا ایک ادنیٰ سا مقلد کہہ سکتے ہیں۔

س آپ نے دو سفرنامہ ہائے حجاز بھی تو لکھے تھے؟

ج جی ہاں 2016 میں، میرا عمرے کا سفرنامہ چھپا۔ اس سفرنامے کو بھی الحمد للہ بہت مقبولیت ملی۔ اس کے اب تک دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس سفرنامے کا ممتاز مفتی کے ''لبیک'' سے موازنہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ ''لبیک'' دراصل صرف داخلیت کا مظہر ہے جبکہ پہلی پیشی داخلیت اور خارجیت کا امتزاج ہے۔ عمرہ کر کے آنے والا کوئی اور شخص جب ''پہلی پیشی'' کا مطالعہ کرتا ہے تو پکار اٹھتا ہے۔

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

2018 میں میرا سفرنامۂ حج ''حج بیتی'' چھپا۔ یہ دونوں کتابیں میری اپنی سرمایہ کاری سے چھپیں۔ اگر مجھے بھی مستنصر حسین تارڑ، عطاالحق قاسمی، امجد اسلام امجد اور احمد فراز کی طرح کوئی بے لوث اور بہادر پبلشر میسر آ جائے تو میرا بہت سا کام سامنے آ سکتا ہے۔ سنگِ میل والے افضال احمد میرے دیرینہ مہربان ہیں لیکن پاس کی چیزیں دوستوں کو کم ہی دکھائی دیتی ہیں۔

س آپ نے اب تک کن کن ملکوں کے دورے کئے؟

ج نومبر 2000 میں، مجھے جمشید مسرور کی دعوت پر ناروے جانے کا موقع ملا۔ 2004 میں دو دفعہ انڈیا گیا۔ دو ہی بار سعودی عرب گیا۔ ان اسفار سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر آپ کسی پاکستانی میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہیں تو اسے کم از کم ایک ہفتے کے لئے انڈیا بھیج دیں۔ وہاں کے ہندو اور مسلم عوام کی حالتِ زار دیکھ کر اسے پاکستان سے پیار ہو جائے گا۔ اگر آپ کسی کو اچھا شہری بنانا چاہتے ہیں تو اسے ایک ہفتے کے لئے کسی یورپی ملک میں بھیج دیں۔ وہاں وہ دیکھ لے گا کہ وہاں کس طرح شہری قوانین کی پابندی کرتے ہیں اور اگر کسی کو عبادت گزار مسلمان بنانا چاہتے ہیں تو عمرے کے لئے سعودی عرب بھیج دیں۔

س اب تک آپ کو کتنے اعزازت مل چکے ہیں؟

ج اعزازت اب ملتے نہیں، چھیننے پڑتے ہیں۔ آپ کا اہل سیاست سے تعلق ہو تو آپ ایک گانا گا کر بھی پرائیڈ آف پرفارمنس حاصل کر سکتے ہیں۔ میں لاتعداد قومی نغمے لکھ چکا ہوں۔ کشمیر پر میرا لکھا ہوا ایک نغمہ بیک وقت ریڈیو پاکستان اور پی ٹی وی پر چلتا ہے لیکن صدارتی ایوارڈ کے لئے شخصیات کا انتخاب کرنے والوں کی نظر ہم جیسوں پر نہیں پڑتی جو کرائے کے مکانوں میں رہ کر بھی حب الوطنی سے سرشار شاعری کرتے ہیں۔ فی الوقت یہ اعزاز حاصل ہے کہ حلقۂ ارباب ذوق جیسے ادارے کا سینئر رکن ہوں۔ الحمرا ادبی بیٹھک کی ممبر شپ سکروٹنی کمیٹی کا رکن رہا ہوں۔ الحمرا کی سکرپٹ کمیٹی کا رکن ہوں۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن نے ایک بار مجھے شاعری پر پچاس ہزار روپے کا انعام دیا۔ 2014 سے نیشنل بک فاؤنڈیشن کا ایک ایمبسڈر رہوں۔ ایم اے اور ایم فل کے مقالے مجھ پر لکھے جا رہے ہیں۔ یہ نہایت مزے کی بات ہوگی کہ میں ان دنوں جس یونیورسٹی سے ایم فل کر رہا ہوں، اس یونیورسٹی میں میری شخصیت اور فن پر ایک طالبہ ایم فل کر رہی ہے۔

س آپ نثر نگار بھی ہیں اور شاعر بھی۔ شاعری زیادہ مرغوب یا نثر؟

ج شاعر عام طور پر، نثر لکھنے سے کتراتے ہیں لیکن میں نثر بھی مزے لے کر لکھتا ہوں۔ شاعری اور نثر دونوں میں میرا دل دھڑکتا ہے۔

س الیکٹرانک میڈیا سے دوری کی وجہ سے کتاب سے دوری کا رواج عام ہو چلا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

ج بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔ کتاب سے دوستی دراصل ایک کلچر کا نام ہے۔ یہ کلچر آپ خود ہی پیدا کر سکتے ہیں اور خود ہی ختم بھی کر سکتے ہیں۔ میرے مکان کے پانچوں کمروں میں ہر وقت بے شمار کتابیں موجود رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارے کچن میں بھی دو چار کتابیں ضرور پڑی رہتی ہیں۔ میرے بچے بھی نئی نسل کے پروردہ ہیں لیکن وہ تو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پرانے اور موجودہ ادیبوں کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ کتاب پڑھنا ایک نشہ ہے۔ جسے ایک دفعہ لگ جائے وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ ویسے میں سمجھتا ہوں کہ آج سے بیس

سال پہلے کی نسبت زیادہ کتابیں چھپ رہی ہیں اور بک رہی ہیں۔ ہر سال منعقد ہونے والے کتاب میلوں میں کروڑوں روپوں کی کتابیں بکتی ہیں۔

س ہمارے سرکاری ادبی اداروں کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج یہ ادارے بہت کمزور پڑ چکے ہیں۔ یہ اپنی بقا کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے دور میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کے لئے اعزازی طور پر اتنا کام کیا کہ اس ادارے سے تنخواہ پانے والوں نے بھی نہیں کیا ہوگا۔ اب یہ ادارہ دم توڑ چکا ہے۔ اس محکمے کے وفاقی وزیر شفقت محمود کو ایک بار میں نے اپنے کام میں جھنجھوڑا تو انہوں نے لاہور کے ادیبوں سے ملاقات کی محفل برپا کی۔ یہ بات مجھے ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے بتائی تھی۔ اگر ان اداروں کی سربراہی سینئر اور معزز و محترم ادیبوں شاعروں کو دے دی جائے تو یہ ادارے آج بھی اپنی ساکھ بحال کر سکتے ہیں اس حکومت نے ان ادبی اداروں کو ہائر ایجوکیشن کمیٹی کی یونیورسٹیاں سمجھ لیا ہے۔ اسی لئے ان کی سربراہی کے لئے پی ایچ ڈیز شخصیات کو ڈھونڈ رہی ہے۔

س تخلیقیت کیا ہے؟ ایک اچھے تخلیق کار سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

ج ایک معمولی سی بات کو بہترین اسلوب میں بیان کر دینا تخلیقیت ہے۔ ایک عام آدمی اپنے دل کی بات چند لگے بندھے الفاظ میں ادا کرتا ہے۔ جبکہ ایک تخلیقی شاعر یا ادیب ایک ہی بات کو کئی اسالیب میں بیان کرنے پر قادر ہوتا ہے۔

س کوئی بے حد آسودہ وقت؟ تخلیقی سطح پر بھی اور زندگی کی سطح پر بھی؟

ج جب میں مرغی کی طرح انڈا دے کر فارغ ہو جاتا ہوں تو خود کو بہت آسودہ محسوس کرتا ہوں۔ زندگی میں ہر سفر کا ہر لمحہ میرے لئے آسودگی کا لمحہ ہے۔ یہ سفر ہی ہے جو تجھے تخلیقی طور پر نئے نئے رنگوں سے آشنا کرتا ہے۔ بقول میر

سرسری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

جب میں تخلیق کے عمل سے گزرنے کے بعد اپنے بچوں کے درمیان بیٹھتا ہوں تو خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا ہوں۔

س مشاعروں پر جو زوال آیا ہوا ہے، اس کا ذمہ دار کون ہے؟ آج کل مشاعروں پر ہم پر جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے، کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ج ہمارے مشاعرے کی روایت کو نئے میڈیا چینلوں نے توڑا ہے۔ ان چینلوں نے اس روایت کو توڑا ہی نہیں مسخ بھی کیا ہے۔ پھکڑ پن کو مزاح کے نام پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس صورت حال میں مجھے پی ٹی وی کے مشاعرے اچھے لگنے لگے ہیں جو کبھی کبھار ہوتے ہیں لیکن تمام ادبی تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر منعقد کئے جاتے ہیں اگر پی ٹی وی مزاحیہ مشاعروں کی بھیڑ چال سے باہر نکل آئے تو ادب کی مزید خدمت کر سکتا ہے۔ مجھے پی ٹی وی کے سینئر پروڈیوسروں سید محسن جعفر، آغا قیصر عباس اور سید اظہر فرید سے بہت توقعات ہیں۔ میرے یہ تینوں دوست نہایت ذمہ داری سے پی ٹی وی کی ساکھ بنانے میں مصروف ہیں۔

س کسی شاعر یا ادیب کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملتی ہے؟ مشاعرے سے یا اندرون سے؟

ج زندگی کا مشاہدہ شاعروں ادیبوں کو لکھنے کی تحریک دیتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ لکھنا صرف اندر کی بات ہیں۔ جس طرح بدن میں روح ہوتی ہے اس طرح لفظوں میں جان ڈالنے کے لئے آپ کو اپنے دل پر بہت سے زخم سہنا پڑتے ہیں۔ درد برداشت کرنا پڑتا ہے۔ میں زخم اور درد آپ کے مردہ لفظوں کو زندہ کرتے ہیں۔

س آپ ادب کے فروغ میں سوشل میڈیا کے کردار کو کس طرح دیکھتے ہیں؟

ج سوشل میڈیا کا تخلیق سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تخلیق کاروں کے باہمی رابطے کا ایک ذریعہ تو ہو سکتا ہے تخلیق کا باعث ہرگز نہیں ہو سکتا۔ سوشل میڈیا نے ہمارے ادیبوں شاعروں کو نہایت خطرناک قسم کی خود پسندی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب وہ سیکھنے سے محروم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

س ادب کے حال اور مستقبل سے آپ مطمئن ہیں؟

ج بالکل مطمئن ہوں۔ ہمارے ہاں اچھی نثر لکھنے اور اچھا شعر کہنے والے ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ آج بھی موجود ہیں۔ بس یہ ہے کہ پہلے یہ لوگ بہت جلد مقبول ہو جاتے تھے پہلے تخلیق کار کو نقاد میسر آ جاتے تھے۔ آج نقادوں نے جینوئن تخلیق کاروں کے بجائے اپنے دوستوں کے بارے میں لکھنا شروع کر دیا ہے۔ جامعات نے تنقید کو برباد کر دیا ہے۔ میں ترا حاجی بگوئم، تو مرا ملا بگوئی کیفیت ہے۔

س کس ادیب یا شاعر کی طرزِ تحریر یا نثر نگاری سے متاثر ہیں؟

ج مجھے قدرت اللہ شہاب جیسی سیدھی سادھی نثر اچھی لگتی ہے جو سادگی کے باوجود آپ کو جکڑے رکھتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کی نثر چراغ تلے، خاکم بدہن اور زرگزشت تک تو مزہ دیتی ہے لیکن بعد میں آنے والی ان کی دونوں کتابوں میں بوجھل پن پایا جاتا ہے۔ کالم نگاری میں ابنِ انشا اور عطاالحق قاسمی میرے پسندیدہ ہیں۔ قاسمی صاحب نہایت سہولت سے بڑی سے بڑی بات کہہ ڈالتے ہیں۔

یاد رکھئے قاسمی صاحب کے بارے میں یہ بات میں اس وقت کہہ رہا ہوں جب قاسمی صاحب کسی سرکاری عہدے پر فائز نہیں۔ آج یہ بھی توقع نہیں کہ وہ پرائیڈ آف پرفارمنس کے لئے میرا نام بھیج دیں گے۔ میں کالم لکھتے ہوئے ہمیشہ قاسمی صاحب کی پیروی کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ادبی خبریں

✧ تنظیم کارِ خیر گوجرانوالہ کے دوسرے آل پاکستان مقابلۂ کتب کے ایوارڈ یافتگان کے لئے تقریب 6فروری 2021ء کو مشرقی سائنس کالج گوجرانوالہ (نزد کنگناں والا چوک) میں منعقد ہوئی۔ صدارت ڈاکٹر قبلہ ایاز (چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل اور وائس چانسلر اسلام آباد یونیورسٹی) نے کی۔ خصوصی مہمانوں میں پاکستان مسلم لیگ (ضیاء) کے بانی وصدر اعجاز الحق (ایم این اے) اور خانہ کعبہ کے کلید بردار میاں عبدالرحمٰن تھے۔ ابتدائی نظامت میزبان تنظیم کے بانی اور روح رواں پروفیسر ڈاکٹر عبدالماجد حمید المشرقی نے کی۔ عمومی نظامت اس تنظیم کی سیکرٹری پروفیسر صائمہ زبیر اور پروفیسر ڈاکٹر امین جان نے کی۔ تلاوت حافظ محمد بن سیف اللہ نے کی۔ پھر قاری راشد نے تلاوت کی سات قرأتوں کے نمونے پیش کئے۔

میزبان تنظیم کی طرف سے مولانا زاہد الراشدی اور صدر تنظیم حاجی خالد رشید نے خطاب کیا۔ تقریب کے انعقاد میں پاکستان یوتھ اسمبلی کا اشتراک بھی شامل تھا۔ ایک ہزار سے زائد خواتین وحضرات اور طلبہ و طالبات حاضرین میں موجود تھے۔ یوتھ اسمبلی کے صدر بابر سلہری نے بھی خطاب کیا۔ تنظیم کارِ خیر کا موٹو ہے: نہ فرقہ نہ سیاست، نہ نفرت نہ تعصب، مشرقی سائنس کالج کوئی دو ایکڑ رقبے پر ہے۔ عمارات تین منزلہ ہیں۔ مذکورہ مقابلۂ کتب میں 2018/19ء کی کتب شامل تھیں۔

☆ 12 فروری بروز اتوار جہلم ادبی فورم کے زیراہتمام بیادِ اقبال کوثر شعری نشست منعقد ہوئی صدارت بیدانصر نے کی ارشد شاہین نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی نظامت کے فرائض جہلم ادبی فورم کے صدر اقبال احمد قمر نے ادا کئے نشست دو حصوں پر مشتمل تھی۔ پہلے حصہ میں تنویر طاہر کیانی، اعجاز روشن، احسان شاکر، رحمت اللہ جاوید، اقبال قمر پروفیسر محمود پاشا، امجد میر، سید انصر اور ارشد شاہین نے اقبال کوثر کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے گفتگو کی۔ دوسرے حصہ میں مشاعرہ ہوا جس میں صدر سید انصر مہمانِ خصوصی ارشد شاہین، اقبال احمد قمر، منصور فائز، امجد میر، شیخ راشد منیر، ایم ایم یادش، احسان شاکر، رحمت اللہ جاوید، اعجاز روشن، پروفیسر محمود پاشا، سلیم طاہر، تنویر طاہر کیانی اور دانش علی دانش نے اپنا کلام پیش کیا۔

☆ علمی، ادبی، سماجی و ثقافتی تنظیم جگنو انٹرنیشنل کی ساتویں سالگرہ کی تقریب الحمراء ادبی بیٹھک لاہور میں ہوئی۔

☆ چنن رائٹرز فورم کے تحت تبسم ناز کے شعری مجموعہ ''پہلا قدم'' کی تقریب رونمائی ہوئی۔ صدارت ممتاز راشد لاہوری نے کی۔ ساتھ مشاعرہ بھی ہوا۔

☆ ادیب وشاعر اسلام عظمیٰ کے اعزاز میں نشست معروف شاعر شہزاد شیخ کے ہاں ہوئی۔

☆ نداسر گودھوی کے اعزاز میں تقریب ماڈل ٹاؤن پارک لاہور میں ہوئی

☆ پنجابی سنگت پاکستان کا سالانہ مشاعرہ ''پلاک'' میں ہوا۔ صدارت عدل منہاس لاہور نے کی۔

☆ اکادمی ادبیات اپر مال لاہور نے سالِ نو مشاعرہ زیر صدارت ڈاکٹر کنول فیروز (مدیر ''شاداب'') منعقد کیا۔

☆ چنن رائٹرز فورم کے تحت تبسم ناز کے تحت مشاعرہ اکادمی ادبیات میں ہوا۔ صدارت: پروین سجل

☆ ادارۂ خیال وفن کے تحت مقصود سعید کی مرتبہ کتاب ''لہجے'' کی رونمائی اکادمی ادبیات لاہور میں ہوئی۔ صدارت باقی احمد پوری، مقررین: پروفیسر عالم خاں، ممتاز راشد لاہوری، عاصم بٹ، شفیق احمد خاں، شہر بانو، ریاض رومانی، ڈاکٹر مریم سہیل، شاہین نواز، ریاظ احمد، طفیل اعظمی، شہر یار، احمد سبحانی آکاش، محمد جمیل، بیگم سعید مقصود۔

☆ ادارۂ خیال وفن اور چنن رائٹرز فورم کے تحت اکرم سحر فارانی کی دو کتب کی رونمائی۔ صدارت: پروفیسر ناصر بشیر۔

مقررین: توقیر احمد شریفی، اقبال راہی، ممتاز راشد لاہوری، رابعہ رحمٰن، جاوید صدیق بھٹی، مہ جبیں ملک، محمد جمیل، پروین وفا ہاشمی۔

☆ نوائے قلم اور چنن رائٹرز فورم کے تحت زرقا نسیم کے اعزاز میں مشاعرہ۔ صدارت: ممتاز راشد لاہوری۔ مقررین: منشا قاضی، مصور شفیق فاروقی، فراست بخاری، جاوید صدیق بھٹی، مہ جبیں ملک، احسان حسن ساحر، ایاز الغنی، سلیم حیدر سلیم۔

☆ ادارۂ خیال وفن کے تحت کامران ناشط کے اعزاز میں اکادمی ادبیات اپر مال لاہور میں تقریب ہوئی۔ صدارت ڈاکٹر سلیم سہیل نے کی۔ مقررین: حسین مجروح، منظر حسین منظر، ڈاکٹر خالد اقبال یاسر، علی اصغر عباس، ممتاز راشد لاہوری، ریاظ احمد، ڈاکٹر امجد طفیل، سلیم شہزاد، عابد حسین عابد، زاہد حسین، پروفیسر شفیق احمد خاں، ایثار باجوہ، آفتاب جاوید احسان الحق مظہر اور دیگر۔

معروف شاعر، ادیب، محقق اُستاد میانوالی یونیورسٹی کے HOP پروفیسر ڈاکٹر شفیق آصف کو ڈین آف آرٹس اینڈ ہیومینز مقرر کر دیا گیا۔

☆ پُرنم لنگر خانہ کا سلسلہ محمد اقبال پیام چیئرمین بزم پرنم کی کاوشوں سے جاری و ساری ہے جس میں ہر جمعرات کو لنگر کا بھرپور اہتمام کیا جاتا اور اُس کے ساتھ قوالی، خطاب، محفل میلاد و نعتیہ مشاعرہ بھی منعقد ہوتا ہے بزم ترنم برصغیر پاک و ہند کے معروف نعت گو شاعر پرنم الہ آبادی کے ایصال ثواب اور یاد کے لئے قائم کیا گیا ہے۔

انٹرویو: شہزاد نیّر

س شہزاد نیر کون ہے؟

ج آج تک یہ کون بتا سکا ہے کہ وہ کون ہے۔ خلیل جبران نے کہا تھا کہ میں اس شخص کے سامنے لاجواب ہو جاتا ہوں جو مجھ سے پوچھتا ہے کہ میں کون ہوں۔ ہمارے بلھے شاہ فرما گئے ہیں " کیہہ جاناں میں کون"۔ علامہ نے بھی کہا تھا" اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے"۔ جب اتنے بڑے لوگ اس سوال سے کترا کے گذر گئے مجھ ایسا ہیچمدان کیا کہے۔۔۔۔ بس اتنا کہ میں خود کو اپنی شاعری کے وسیلے سے دریافت کرتا ہوں۔۔۔۔ کچھ آدھی ادھوری جھلکیاں میسر آتی ہیں۔۔۔ میں وہی ہوں جو اپنی تحریر میں ہوں۔۔۔ وہ بھی اگر میں ہوں تو۔

س شاعری کی تعریف کیا ہے؟ کیا اسے زندگی کا ترجمان ہونا چاہیے یا زندگی سے فرار کی سہولت کار؟

ج شاعری کی کوئی ایک تعریف ممکن نہیں ہوگی۔ کئی زاویوں سے کئی تعریفیں ہو سکتی ہیں۔ قدیم عربوں نے ایک تعریف یوں متعین کر رکھی تھی کہ وہ کلام موزوں جو قصداً بطور شعر کہا جائے۔

مجھے لگتا ہے شاعری زندگی کو دیکھنے کے ایک خاص زاویے کا نام ہے۔ اس میں مناسب ترین الفاظ اور دلکش ترین اسلوب میں بات کہی جاتی ہے۔ کسی بھی زبان کا بہترین اظہار اس کی شاعری میں ہوتا ہے۔

شاعری کچھ بھی ہو، زندگی کی ترجمان ہی ہوتی ہے۔ زندگی کے ہزار رخ ہیں۔ شاعری ہر رخ سے زندگی کا بیان کرتی ہے۔ حیات و کائنات کی ترجمانی کرتی ہے۔ زندگی سے فرار چاہنا بھی زندگی ہی کا ایک پہلو ہے۔ شاعری اس سے بھی پہلو تہی نہیں کرتی۔ امید و یاس بھی زندگی ہی کی دو کیفیات ہیں۔ کیسے ممکن ہے کہ شاعری کسی ایک کو فراموش کر دے۔ یوں شعرا نے زیست کی مکمل ترجمانی کی ہے۔ یہاں فانی بدایونی بھی ہیں اور جوش ملیح آبادی و اختر شیرانی بھی۔

مجھے ذاتی طور اظہار کی صداقت والی شاعری پسند ہے جو زندگی آمیز اور زندگی آموز ہو۔ میرا جھکاؤ ترقی پسندی کی طرف ہے۔ فنی پاسداری کے ساتھ حیات و کائنات کے درو اکرتی شاعری میرے نزدیک اہم ہے۔ احساسات و جذبات و کیفیات کا سچا اظہار بھی شاعری کو ارفع بناتا ہے۔ ہر حال میں شاعری کو زندگی اور زمین سے جڑا ہوا ہونا چاہیے۔

س تخلیق کو پذیرائی کی ضرورت ہوتی ہے یا تخلیق کار کو؟

ج تخلیق کی پذیرائی ہی تخلیق کار کی پذیرائی ہے۔ مجھے لگتا ہے پذیرائی اور مقبولیت سے شاعر کو مزید اچھا کہنے کی تحریک ملتی ہے۔ کارِ سخن گری میں داد و تحسین اجرت کی طرح ہیں۔ سخن شناسوں کی پسندیدگی سے شاعر کو تسکین بھی ملتی ہے اور اس کا حوصلہ بھی بڑھتا ہے۔

دراصل یہ سب عزت و آبرو تخلیق کے سبب ہی ہے۔ تخلیق کی مدح دراصل خالق کی مدح ہوتی ہے۔ کئی صورتوں میں تخلیق اپنے تخلیق کار سے بھی آگے نکل جاتی ہے جیسے ہمیں کئی ایسے اشعار یاد ہوتے ہیں جن کے شاعر کا نام ہمیں معلوم نہیں ہوتا۔ اچھا شعر خود سفر کرتا اور پذیرائی حاصل کرتا ہے۔

بہت بار ایسے ہوا کہ میں نے مشاعرے میں کوئی غزل سنائی اور سامعین میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم تک غزل تو پہنچ چکی تھی لیکن آج معلوم ہوا کہ کس کی ہے۔ اسی طرح میری نظموں "ہدایت کار" اور "سیاچن" کا معاملہ ہے۔ جب ان کی پذیرائی ہوتی ہے تو سمجھیں میری پذیرائی ہوئی۔

س کیا آپ کو مشاعرے پڑھتے ہوئے کبھی یہ احساس ہوا کہ یہ کام تخلیق کار کے منصب کے منافی ہے؟

ج کبھی بھی نہیں۔ مشاعرہ ہماری خوب صورت گنگا جمنی تہذیب کا ایک عدیم النظیر مظہر ہے۔ اپنی اصل میں یہ ایک سنجیدہ ادبی و ثقافتی سرگرمی ہے اور تخلیق کار کے منصب کے عین مطابق۔ اس کے ذریعے ہمارے ذوق ادب کی تسکین ہوتی ہے۔ سماعت کی تربیت ہوتی ہے۔ تلفظ اور ادائیگی کا پتہ چلتا ہے۔ انسان لطف کلام کے ساتھ ساتھ نکتہ ہائے دانش بھی حاصل کرتا ہے۔

میں نے اندرون و بیرون ملک لاتعداد مشاعرے پڑھے ہیں اور کبھی ایسا احساس نہیں ہوا کہ تخلیق کار کو اس کا حصہ نہیں بننا چاہیے۔ میں تو مشاعرہ پڑھ کے اور سن کے بہت کچھ سیکھتا ہوں۔

یہ الگ بات کہ کچھ برسوں سے بعض جگہ مشاعرے ایسا تہذیبی و ثقافتی مظہر کچھ غیر سنجیدگی کا شکار ہوا ہے۔ اس کی ایک وجہ مزاحیہ مشاعرے بھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بنیادی طور پر مشاعرے کو سنجیدہ ہی ہونا چاہیے۔ ہاں چند معیاری مزاح گو شامل ہو جائیں تو ٹھیک۔ مکمل مزاحیہ مشاعرے سے سامعین و ناظرین کو یہ تاثر جاتا ہے کہ شاعری مزاح گوئی ہی کا نام رہ گیا ہے

کچھ شاعروں کی اوور ایکٹنگ اور مشاعروں میں نعرے بازی دیکھ کر ضرور یہ لگتا ہے کہ ایسا کرنا وقارِ سخن اور آبروئے کلام کے منافی ہے۔

س اپنے بچپن، تعلیم اور ملازمت کے متعلق ہمیں کچھ بتائیں۔

ج میرا بچپن گوجرانوالہ کے گاؤں گوندانوالا میں گذرا۔ یہ ایسا ہی بچپن تھا جیسا وسطی پنجاب کے گاؤں کے کسی متوسط گھرانے کے بچے کا ہوتا ہے۔ کھیتوں،

باغوں، پرندوں، تتلیوں کے بیچ اڑتا ہوا بچپن۔
میں نے میٹرک تک تعلیم گاؤں کے سکول سے حاصل کی۔ اس کے بعد ایف سی کالج لاہور میں ایف ایس سی میں داخلہ لے لیا۔ یہ بہت بڑی ثقافتی چھلانگ تھی۔ میں لاہور جیسے شہر کی تیز رفتار اور مختلف زندگی کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ آپ اندازہ کریں کہ پہلی بار پتلون قمیص میں نے لاہور آ کر فسٹ ائیر میں پہنی کیونکہ یہاں ہر کوئی پتلون پہنے پھرتا تھا۔
ایف ایس سی کے بعد میں نے پاکستان آرمی میں شمولیت اختیار کر لی۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول ایبٹ آباد سے دوسالہ تربیت کے بعد میں نے توپ خانے میں بحیثیت افسر کمیشن حاصل کیا۔
آرمی کی ملازمت کے دوران میں بھی حرف وسخن اور لفظ و کتاب سے ناتا جوڑے رکھا۔ بلکہ جسم و جاں کی کڑی آزمائشوں میں بھی لفظوں نے مجھے حوصلہ دیا۔ کارگل کی جنگ ہو یا سیاچن گلیشیر کا علاقہ، لائن آف کنٹرول ہو یا جنوبی وزیرستان، میں نے فرائض کی ادائیگی کے بعد سارا وقت مطالعے اور ادب کو دیا۔
مدت ملازمت کی تکمیل کے بعد میں بحیثیت میجر، سبک دوش ہو کر لاہور میں مقیم ہوں اور ایک تعلیمی ادارے میں ملازمت کر رہا ہوں۔

س اب تک کتنی کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے کتنی کتابوں کو آپ کی توقع کے مطابق پذیرائی ملی۔ مستقبل میں کیا ارادے ہیں؟

ج میری شاعری کی 4 اور ترجمے کی 2 کتب شائع ہو چکی ہیں۔
پہلی کتاب نظمیہ مجموعہ " برفاب " ہے جس کو pen انٹرنیشنل ایوارڈ ملا۔
دوسری کتاب چاک سے اترے وجود میں نظمیں غزلیں شامل ہیں۔ اسے پروین شاکر عکس خوشبو ایوارڈ سے نوازا گیا۔
اس کے بعد مجموعہء نظم " گرہ کھلنے تک " ہے اور 2 سال پہلے چوتھی کتاب " خوابشار " شائع ہوئی جس میں تازہ ترغزلیات ہیں۔
میری سب کتابیں اہل نظر اور عام قارئین تک پہنچیں۔ تین تین چار چار ایڈیشن شائع ہوئے۔ نصف درجن کے قریب جامعاتی تحقیقی مقالے لکھے گئے۔ ایم فل بھی ہوا۔ میں اپنی کتابوں کی پذیرائی پر مسرور و ممنون ہوں۔
شعری مجموعوں کے علاوہ میں نے دو علمی و تربیتی کتب کے انگریزی سے اردو میں تراجم بھی کیے ہیں۔
مستقبل میں تین کتابیں لانے کا ارادہ ہے۔ ایک مائکرو فکشن اور دوسری نظموں کی کتاب ہوگی۔ تیسری کتاب میری جنگ کارگل کی یادداشتوں پر مشتمل ہوگی۔

س چند یادگار مشاعروں کا احوال بیان کیجیے۔

ج ایک مشاعرہ تو برمنگھم میں ہوا تھا۔ اس کا اہتمام مرحوم انور مغل نے کیا تھا۔ شکاگو سے مرحوم افتخار نسیم افتی آئے، سعادت سعید ان دنوں انگلستان ہوتے تھے وہ وہاں سے تشریف لائے اور پاکستان سے یہ خاکسار۔ کچھ مقامی شعرا بھی شریک تھے۔ اس مشاعرے کی خاص بات یہ تھی کہ سامعین میں ہندو پاک سے تعلق رکھنے والے مسلم، سکھ اور ہندو سب شامل تھے۔ اردو کی گنگا جمنی روایت کے اس محبت بھرے اظہار نے مجھے متاثر کیا۔ اسی طرح برمنگھم کے قریب واقع شہر ڈڈلی میں ایک مشاعرہ منصور آفاق نے کرایا تھا۔ اس میں مرحوم محسن احسان، عطاء الحق قاسمی، احسان شاہد اور انگلستان کے کچھ شعرا شریک ہوئے۔ اس مشاعرے کا پرجوش ماحول بھول نہیں سکتا۔
ان کے علاوہ کراچی کا ساکنان شہر قائد عالمی مشاعرہ بھی زندگی بھر یاد رہے گا۔ سامعین کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تا حد نگاہ موجود تھا۔ اتنی تعداد میں لوگ سیاسی جلسوں میں شریک ہوتے ہوں گے۔ اور شعرا بھی دنیا بھر سے تشریف لائے تھے۔
ان کے علاوہ دوبئی کے چند مشاعرے بھی میرے ذہن میں تازہ رہتے ہیں۔ یونی ورسٹی آف گجرات، یونی ورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنولوجی لاہور کے مشاعرے بھی یادگار رہوتے ہیں۔

س زندگی کے چند ایسے واقعات جن کو شیئر کرنا چاہیں۔

ج زندگی ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جو یادگار کہے جا سکتے ہیں۔ ان کا احوال لکھوں تو کتاب ہو جائے۔ دراصل واقعے سے زیادہ یہ بات اہم ہوتی ہے کہ آپ کسی واقعے کو کس تناظر میں دیکھتے ہیں اور اس سے کیا معنی اخذ کرتے ہیں۔ اس پہلو سے دیکھیں تو چھوٹا واقعہ بھی بڑا ہو سکتا ہے۔ اگر کاغذ چنتے کم سن بچے کی آنکھوں میں منجمد حسرتوں کو دیکھا جائے تو وہ میرے نزدیک ایک بڑا واقعہ ہو سکتا ہے۔
ویسے سیاچن گلیشیر، وزیرستان، کشمیر، بلوچستان میں رہ کر بہت سے جان لیوا حالات سے گذرا۔ یہ سب اپنے اندر بڑے بڑے واقعات رکھتے ہیں جن کا ذکر پھر کبھی سہی۔

س کیا اُردو میں جو شعری تنقید لکھی گئی ہے اس سے آپ مطمئن ہیں؟

ج اردو میں بہت اچھی شعری تنقید بھی لکھی گئی جیسے شمس الرحمٰن فاروقی اور بہت کمزور بھی لکھی گئی جیسے تقریظیں اور دیباچے۔ میں عمدہ تنقید اس کو مانتا ہوں جو ادب کو تاریخ، تہذیب، بشریات اور سماجیات کے وسیع تر تناظر میں رکھ کر دیکھے۔ یا وہ تنقید جو لسانی مظاہر سے تہذیبی عناصر کی بازیافت کرے۔ ہمارے ہاں محمد ارشاد اور اسلم سراج الدین نے کچھ حد تک یہ کام کیا ہے۔
پچھلے بیس تیس سال میں زیادہ تر تنقید چند تنقیدی تھیوریوں کے گرد گھومتی رہی۔ میری مراد ساختیات، پس ساختیات، جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساخت شکنی وغیرہ سے ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ان نظریات پر بات ہی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اتنی زیادہ بات نہیں ہونی چاہیے تھے۔

ہزاروں اوراق سیاہ کر دیے گئے لیکن یہ تھیوریاں ہمارے ادب کے لیے لگ بھگ اجنبی ہی رہیں۔ وجہ یہ کہ نظری مباحث کی بھرمار میں عملی اطلاقی نمونے نہ ہونے کے برابر رہے۔ کسی حد تک ان کا اطلاق ناصر عباس نیر نے کیا۔ ان کا زیادہ تر تنقیدی کام وقیع ہے۔ خاص طور پر جو انہوں نے حالیہ سالوں میں لکھا مثلاً نوآبادیت پر۔

مجموعی طور پر شعری تنقید کا معیار مناسب سا اور آفاق محدود سے رہے۔ اس ضمن میں مزید کام کرنے کی ضرورت موجود ہے۔

س 80ء، 90ء، 2000 اور 21 ویں صدی ان میں سے کس دہائی میں غزل آپ کو عروج پر دکھائی دیتی ہے؟

ج اگرچہ رفتار ادب کو دہائیوں میں بانٹ کر جانچنا منطقی تو نہیں لیکن سمجھنے سمجھانے کے لیے شاید اس طریقے سے مدد لی جا سکتی ہے۔

بات یہ ہے کہ نئی صدی کی نمائندہ غزل اپنی ماقبل غزل سے خاصی مختلف ہے۔ نئے تلازمے، نئے استعارے، انگریزی روزمرہ کا بے تکلف (اور بے محابا) استعمال، میڈیائی اصطلاحات اور الفاظ کا غزل میں داخلہ، جدید شہری معاملہ بندی کا اظہار، سرسری معاشقوں کا احوال وغیرہ۔۔۔ اس سب سے غزل کا ذائقہ خاصا تبدیل ہوا ہے۔ ظاہر ہے یہ تبدیلی اس لیے ہوئی کہ اب ہماری سماجی و رومانی زندگیوں میں میڈیا (بشمول سوشل میڈیا) کا عمل دخل بہت بڑھ چکا۔

80 یا 90 کی دہائی کی غزل پر کم یا زیادہ، شکیب، فیض، فراز اور ناصر کاظمی کے اثرات تھے۔ نئی صدی میں منیر نیازی، جمال احسانی، ثروت حسین اور جون ایلیا کے اثرات زیادہ نمایاں ہوئے ہیں۔

آنے والے وقت میں مجھے لگتا ہے کہ غزل تیزی سے تبدیل ہوگی۔ ترکیب سازی سے گریز، سادہ بیانی، روزمرہ بے تکلف زبان اور سطحی و عارضی محبتوں کا بیان غزل میں زیادہ ہوگا۔

میرا یہ ماننا ہے کہ لطف سخن کے لیے جدت و تاثیر کو ساتھ ساتھ رکھنا ہوگا۔

س ادب کی ترویج کے لیے جو سرکاری ادارے کام کر رہے ہیں کیا آپ ان کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟

ج مطمئن ہوں بھی اور نہیں بھی۔ وجہ اطمینان یہ ہے کہ کام بہرحال ہو رہا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان سے اردو ادب کے معمار کی سیریز قابل ذکر ہے۔ مجلس ترقی ادب بھی کچھ نہ کچھ کر رہی ہے۔

تاہم میں سرکاری ادبی اداروں کے ضعف بصارت کا شاکی ہوں۔ یہ لوگ مسلمہ ادبی معیارات کے مطابق نہیں بلکہ میڈیائی شہرت کی بنا پر ادیبوں کو نوازتے ہیں۔ حالانکہ کوئی گم نام ادیب بھی اگر اعلیٰ سطح کا کام کرے تو اسے حکومتی پذیرائی ملنی چاہیے۔ لیکن اس کے لیے سامنے نظر آنے والے چند ناموں کے علاوہ، ادب کے عقبی دیاروں میں جھانکنا پڑتا ہے۔۔۔ مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ۔

اگر ادبی ادارے، قومی ذرائع ابلاغ میں ادب کا کچھ وقت مختص کرا سکیں اور ادبی چینل بنا سکیں تو اچھا ہوگا۔

س سوشل میڈیا کے دور میں کتاب کا مستقبل کیا ہے؟

ج مجھے لگتا ہے کاغذی کتاب کم ہو جائے گی۔ اس کی جگہ ڈیجیٹل کتاب پڑھی جائے گی۔

بیشتر نوجوان شعر و ادب کا مطالعہ سکرین پر کرنا چاہتے ہیں۔ مجھ سے بے شمار لوگ سوشل میڈیا پر پوچھتے ہیں کہ آپ کی کتاب پی ڈی ایف فارمیٹ میں میسر ہے؟ ایک کتاب پہ ہی کیا موقوف، سوشل میڈیا نے ہماری زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر بے پناہ اثرات ڈالے ہیں۔ انتظار، ہجر، وفا، وابستگی، فیملی لائف۔ ہر شے کے معنی بدل رہے ہیں

س ہماری شاعری اور دیگر اصناف سخن کو عالمی سطح پر وہ پذیرائی حاصل نہیں ہو پائی جو کہ دیگر ممالک کے تخلیق کاروں کی ہوتی ہے۔ نوبل پرائز کو ہی لے لیں یورپ کے چھوٹے چھوٹے ملکوں کے متعدد ادیبوں کو مل چکا ہے۔

ج اس کی وجہ ہمارے ادب کا بین الاقوامی مین سٹریم ادب میں نہ ہونا ہے۔

ایک تو ہماری کتاب کم چھپتی ہے۔ دوسرے ترجمہ کاری بہت محدود رہی۔ دوسری زبانوں کا ادب تو اردو میں منتقل ہوا، اردو ادب دوسری زبانوں میں کم ہی ترجمہ ہوا۔

مجھے لگتا ہے کہ قرت العین حیدر کا کام اس سطح کا ہے کہ انہیں نوبل انعام سمیت عالمی اعزازات سے نوازا جاتا۔ لیکن وجہ وہی کہ وہ عالمی سطح پر وہ نفوذ حاصل نہ کر سکیں جو بعض چھوٹے ممالک کے ادبا کر لیتے ہیں۔

اگر اردو ادب عالمی زبانوں میں ترجمہ ہو کر وہاں بیسٹ سیلر رہے تو پھر نوبل، بکر یا پولٹزر پرائز کی توقع رکھنی چاہیے۔

س ارژنگ کے قارئین اور نیا لکھنے والوں کے لیے کوئی پیغام؟

ج ارژنگ کے باذوق قارئین سے عرض کروں گا کہ معیاری ادب کا مطالعہ اپنا شعار بنائیں۔ لسانی استعداد میں اضافہ کر کے ذہنی آفاق کشادہ کیے جا سکتے ہیں۔ حسن، خیر، رواداری، کشادہ قلبی، وسیع المشربی اور انسانیت نوازی عمدہ ادب کے مستقل وظائف ہیں۔

سوال اٹھانے کی عادت ڈالیے۔ بنے بنائے ذہنی سانچے توڑنے کی ہمت پیدا کیجیے۔ تکثیریت کو قبول کیجیے۔ ہر کسی کو اپنے جیسا بنانے کی خواہش تنگ نظری ہی ہو سکتی ہے۔ حیات کا حسن اختلاف طباع میں ہے۔ سب سے اہم بات۔۔۔ اگر کوئی نظریہ، نکتہ نظر یا فرد آپ کو دوسرے انسانوں سے نفرت سکھائے اور تشدد پر ابھارے تو اس پر سوال بھی اٹھائیں اور اس کے خلاف آواز بھی۔ اپنا ایک شعر پیش کر کے اجازت چاہتا ہوں۔

جس گام سوالوں کا سفر روک دے کوئی
اقرار وہیں پھینک کے انکار اٹھانا

تبصرۂ کتب

نام کتاب : تیز ہوا کا شہر/مصنفہ: نیلما ناہید دُرانی/صفحات: 128 /تبصرہ نگار: عامر بن علی

معروف شاعرہ، ادیبہ و دانشور نیلما ناہید درانی کی تازہ کتاب ''تیز ہوا کا شہر'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔اس دلچسپ اور منفرد کتاب کے تین حصے ہیں، پہلا سفر نامہ جو کہ آذر بائیجان کے متعلق ہے جبکہ دوسرا حصہ مضامین پر مشتمل ہے اور تیسرے حصے میں افسانے شائع کئے گئے ہیں۔اس کتاب کے یہ تینوں حصے ایک سے بڑھ کر ایک دلچسپ اور معیاری تخلیقات کے حامل ہیں۔

128 صفحات پر مشتمل اس کتاب کو ادارہ زربفت پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا ہے۔خوبصورت سرورق پر آذر بائیجان کے شہر باکو کی تصویر نظر آتی ہے اور پشت پر سابق پولیس آئی جی ناصر خان درانی نے اظہار خیال کیا ہے جو نیلما ناہید درانی کے فن اور شخصیت کے متعلق ہے۔یاد رہے کہ نیلما خود بھی پولیس میں اعلیٰ افسر رہی ہیں۔لاہور میں ایس پی سپیشل برانچ کے علاوہ پولیس ٹریننگ سکول کی مدار المہام بھی رہی ہیں۔افریقہ اور یورپ میں اقوام متحدہ کی امن فورس میں پاکستان کی کئی برس تک نمائندگی کرتی رہی ہیں۔کتاب کا دیباچہ طاہر انور پاشا نے لکھا ہے جو کہ سابق آئی جی ہونے کے علاوہ بہت اعلیٰ سفر نامہ نگار ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ان کے علاوہ سلمیٰ اعوان کی معتبر رائے بھی شامل اشاعت ہے۔اعلیٰ کاغذ پر معیاری طباعت اور قیمت تین صد روپے ہے، جو کہ بے حد مناسب ہے۔

کتاب کا انتساب سال 2020 اور COVID-19 کے نام کیا گیا ہے۔جس نے تمام دنیا کو گھروں میں قید کر دیا۔انتساب دوم تاشقنداز بکستان میں رہنے والی خاتون شہزودہ شہر یار رونا اور مصنفہ کی جماعت ششم سے تا حال سہیلی صوفیہ تبسم جو کہ اب صوفیہ امجد میر کہلاتی ہیں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔سفر نامہ باکو آذر بائیجان کو دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔کتاب کا یہ حصہ سیاحت اور ادب کا حسین امتزاج ہے۔اس کو پڑھ کر نہ صرف اس ملک کی تاریخ اور ثقافت سے آگاہی ملتی ہے۔بلکہ عمومی سماجی رویوں پر بھی مفصل اور غیر متعصب معلومات حاصل ہوتی ہیں۔مضامین کے حصے میں کچھ شخصیات کے خاکے ہیں جن میں محسن نقوی، طارق عزیز، فضل محمود، عمران خان، مشیر کاظمی، صبیحہ خانم، صدیقہ بیگم شامل ہیں۔آقای صادق گنجی کے متعلق ایک مضمون کے علاوہ مزاحیہ اداکاری کے بے تاج بادشاہ کے نام سے امان اللہ پر ایک تحریر اور مولانا آغا نعمت اللہ جان درانی پر بھی ایک مضمون شامل اشاعت ہے۔آخری حصے میں چھے افسانے اور اداکار عرفان خان مرحوم کے لئے ایک نظم شائع ہوئی ہے۔آخر میں جامعۃ الازہر قاہرہ یونیورسٹی مصر کے پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم کا تیز ہوا کا شہر اور نیلما کی شخصیت پر تبصرہ و تجزیہ شائع ہوا ہے۔نیلما ناہید درانی ان دنوں لندن میں مقیم ہیں مگر اس تازہ تحریر نے ان کی عدم موجودگی کے احساس کو ادبی حلقوں میں کافی حد تک کم ضرور کیا ہے۔

نام کتاب : رباب جاں/مصنفہ: شازیہ رباب/تبصرہ نگار: آغا تنویر

شازیہ رباب عصر حاضر کی ایسی شاعر جو عہد جدید میں عہد قدیم کا حوالہ ہیں۔یہ بات کوئی درفطنی نہیں بلکہ جب آپ ان کی کتاب ''رباب جاں'' مطالعہ کریں گے تو ان الفاظ کی سچائی آپ پر ہویدا ہوتی چلی جائے گی۔کتاب کا عنوان رباب جاں ایک ایسا تریاپ ہے جو جو جانکنی میں مبتلا لوگوں کے لئے اکسیر ثابت ہوگا۔اس کتاب کا ہر شعر احساس جاں کا حامل ہے۔

شاعرہ نے الفاظ کے چناؤ میں عوام و خواص سب لوگوں کی ذہنی اوپج کو مدنظر رکھتے ہوئے آسان اور قدرے پیچیدہ لفظوں کو اپنی شاعری کی زینت بنایا۔ان کا یہ پہلا شعری مجموعہ دودھ سے لبالب بھرے کٹورے میں گلاب کا پھول ثابت ہوگا۔یہ حوالہ اس اثناء پر دیا ہے کیونکہ شاعرہ کا تعلق ملتان سے ہے جو کہ اولیاء کی سرزمین کہلاتی ہے اور ادب کے حوالہ سے لکھنؤ کا ہم پہل ہے۔جہاں بہت سے نامور شعرا اور ادیب اس شہر کی تابانی قائم رکھنے میں اپنا اپنا حصہ ڈالتے ہیں وہاں اس نوجوان شاعرہ کا وجود بھی اس شہر کی چکاچوند میں اضافہ کا باعث بنے گا۔(انشاءاللہ) امید ہے کہ جہاں ادب میں ان کے اوبھی مجموعے ضوفشانی کرتے رہیں گے۔

نامہ ہائے احباب

بہت عزیز بہت محترم حسین عباس صاحب سلامت رہیں آمین! اسلام علیکم!

آپ نے جب سے ارژنگ کی ادارت سنبھالی ہے ارژنگ ظاہر و باطنی طور پر بھی خوبصورت اور بھرپور ہوتا جارہا ہے۔ یہ آپ کی محبت اور اعلیٰ ظرفی ہے کہ آپ ناچیز کو ارژنگ بلا ناغہ جاری رکھے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر عطا فرمائے۔ میرے دل کی گہرائی سے نکلی دعائیں آپ کے شاملِ حال رہیں گی میرا کوئی قلمی تعاون نہ مالی تعاون آپ کے ساتھ ہے مگر اس کے باوجود آپ نے ارژنگ ارسال کرتے ہیں۔ مجھے بے حد ندامت بھی محسوس ہوتی ہے۔ دراصل میں بہت کم لکھتا ہوں۔ میں تو جسمانی عوارض میں مبتلا ہوں جس کی وجہ سے طبیعت کچھ لکھنے پر آمادہ نہیں ہو پاتی حضرت شوکت واسطی مرحوم کا ایک شعر ہے۔

شوکت ہمارے ساتھ بڑا حادثہ ہوا
ہم رہ گئے ہمارا زمانہ چلا گیا

دُعا گو سکون
بوئی ہزارہ

صاحب ارژنگ پیارے حسن عباسی صاحب شعر و نثر کا ''اژرنگ قدر'' ارژنگ بڑے جلوے سے اترا۔ میں ایک دو شماروں سے غیر موجود ہوں اس کا مجھے قلق ہے۔ ارژنگ فن پسند جلوؤں میں سے ایک ہے، شاعر و ادیب کے انفرادی جذبوں کی جمع آوری کی تسکین سمجھ بوجھ چاہتی ہے آپ اردو شاعری میں ایک درجہ رکھتے ہیں، انتخاب میں آپ کی توجہ اور دل بستگی کارگر ہے۔ جمیل یوسف صاحب کا مضمون ''قائد کی زیارت گاہ'' عقیدت و احترام کا مرقع ہے، ان کی پاکستانیت تسلیم شدہ ہے۔ جمیل یوسف صاحب جب بھی پاکستان اور قائداعظم کی بات کرتے ہیں از حد متاثر کرتے ہیں، قائداعظم کی شخصیت اور قیادت کی دنیا بھر میں تعریف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قائداعظم کو ایسی صلاحیتیں عطا کیں کہ انہوں نے بیک وقت کئی قوتوں سے مقابلہ کیا اور پاکستان حاصل کیا ہے۔ پچھلے دنوں قائداعظم کے مزار پر سیاسی اودھم مچایا گیا تھا اس سے تحریک پاکستان کے نام ہواؤں کو ذہنی اور دلی تکلیف ہوئی تھی۔ قائداعظم کے مزار کا تقدس، ہر صورت و قیمت محفوظ رہنا چاہیے۔ مزار پر جوتوں سمیت نعرہ بازی تحریک پاکستان کی تاریخ سے عدمِ واقفیت کا نتیجہ ہے۔ خدا سیاست دانوں اور سیاسی پارٹیوں کے لوگوں کو مشاہیر تحریک پاکستان کی تعظیم سکھائے میں کشمیر کے مخصوص اور چند اشعار رقم کرتا ہوں۔ کشمیر پاکستان اور مسلمانوں کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ کشمیری مسلمان غاصبوں کے شکنجے میں ہیں۔ انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی جارہی ہیں۔ پاکستان کے سیاست دان آپس میں دست و گریباں ہیں۔ افسوس کی بات ہے، ارژنگ کی تحریریں حسبِ معمول دل افروز ہیں۔

آصف ثاقب

حسن عباسی! آداب۔

اُمید ہے مزاج بخیر ہونگے۔ جنوری 2021 کا پہلا شمارہ موصول ہوگیا اپنے خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ تحریریں بھی سبھی لائق تحسین ہیں۔ شاعری بھی عمدہ اور مضامین بھی شاندار، انڈویوز کا سلسلہ بھی خوب ہے۔ صوفیہ بیدار صاحبہ کا انٹرویو بہت عمدہ وہ خود بھی شاندار خاتون ہیں۔ عامر بن علی صاحب کو ان کی ادبی کاوشوں پر مبارک باد۔

آسناتھ کنول، لاہور

محترم جناب عامر بن علی
محترم جناب حسن عباسی صاحب

السلام علیکم! ارژنگ جنوری 2021 پڑھا۔ ہر صفحہ خوب سے خوب تر ہے۔ بالخصوص ڈاکٹر علی محمد خاں کا مضمون ''ڈاکٹر وحید قریشی''، علی اکبر ناطق کا مضمون ''عرفان مجید کی شاعری''، ساحل سلہری کا مقالہ اردو کی چند جدید طویل نظمیں اور بطورِ خاص مضمون ''منیر نیازی کی بزلہ سنجی'' از عامر بن علی بہت ہی خاصے کی چیزیں ہیں۔

محترمہ صوفیہ بیدار کا تفصیلی انٹرویو بھی بہت خوب ہے۔ اتنی کم قیمت میں ارژنگ تک رسائی غنیمت ہے۔ ارژنگ کا معیار اعلیٰ سے اعلیٰ تر ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارژنگ کو مزید ادب کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ اس سارے کام میں عامر بن علی اور حسن عباس صاحب آپ کی خدمات کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں۔ غزل ارسال خدمت ہے۔ شاملِ اشاعت کر کے شکریہ کا موقع دیں۔

فاروق احمد فاروق
گجرات

میں وہی ہوں جو اپنی تحریر میں ہوں

معروف و معتبر شاعر اور نثر نگار میجر (ر)

شہزاد نیّر

سے حسن عباسی اور لبنیٰ صفدر کی گفتگو

زندگی سے فرار چاہنا بھی زندگی ہی کا ایک پہلو ہے۔ شاعری اس سے بھی پہلو تہی نہیں کرتی

کسی بھی زبان کا بہترین اظہار اُس کی شاعری میں ہوتا ہے۔ تخلیق کی پذیرائی ہی تخلیق کار کی پذیرائی ہے

س: شہزاد نیر کون ہے؟

ج: آج تک یہ کون بتا سکا ہے کہ وہ کون ہے۔ خلیل جبران نے کہا تھا کہ میں اس شخص کے سامنے لاجواب ہو جاتا ہوں جو مجھ سے پوچھتا ہے کہ میں کون ہوں۔ ہمارے بلھے شاہ فرما گئے ہیں ''کیہہ جاناں میں کون''۔ علامہ نے بھی کہا تھا ''اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے''۔ جب اتنے بڑے لوگ اس سوال سے کترا کے گذر گئے مجھ ایسا ہیچ مدان کیا کہے۔۔۔ بس اتنا کہ میں خود کو اپنی شاعری کے وسیلے سے دریافت کرتا ہوں۔۔ کچھ آدھی ادھوری جھلکیاں میسر آتی ہیں۔۔۔ میں وہی ہوں جو اپنی تحریر میں ہوں۔۔۔ وہ بھی اگر میں ہوں تو۔

س: شاعری کی تعریف کیا ہے؟ کیا اسے زندگی کا ترجمان ہونا چاہیے؟

ج: شاعری کی کوئی ایک تعریف ممکن نہیں ہوگی۔ کئی زاویوں سے کئی تعریفیں ہو سکتی ہیں۔ قدیم عربوں نے ایک تعریف یوں متعین کر رکھی تھی کہ وہ کلام موزوں جو قصداً بطور شعر کہا جائے۔

مجھے لگتا ہے شاعری زندگی کو دیکھنے کے ایک خاص زاویے کا نام ہے۔ اس میں مناسب ترین الفاظ اور دلکش ترین اسلوب میں بات کہی جاتی ہے۔ کسی بھی زبان کا بہترین اظہار اس کی شاعری میں ہوتا ہے۔

شاعری کچھ بھی ہو، زندگی کی ترجمان ہی ہوتی ہے۔ زندگی کے ہزار رخ ہیں۔ شاعری ہر رخ سے زندگی کا بیان کرتی ہے۔ حیات و کائنات کی ترجمانی کرتی ہے۔ زندگی سے فرار چاہنا بھی زندگی ہی کا ایک پہلو ہے۔ شاعری اس سے بھی پہلو تہی نہیں کرتی۔ امید و یاس بھی زندگی ہی کی دو کیفیات ہیں۔ کیسے ممکن ہے کہ شاعری کسی ایک کو فراموش کر دے۔

(مکمل انٹرویو اندرونی صفحات)

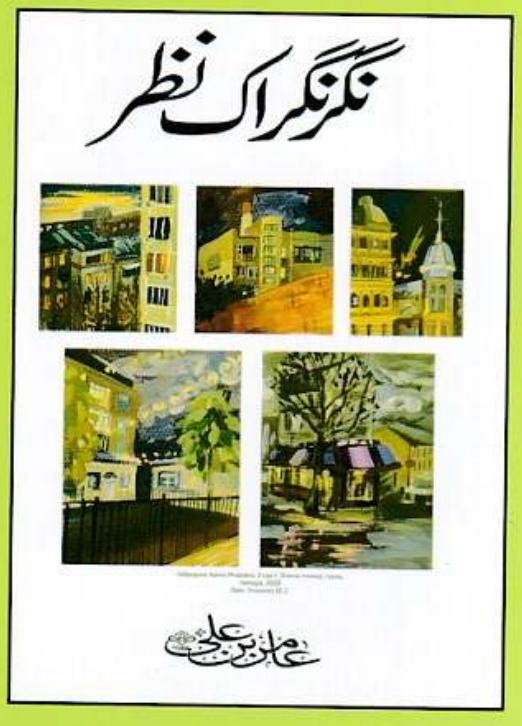

دستاویزی حیثیت اور اہمیت کے حامل سفرناموں
''جہاں گردی'' اور ''آج کا جاپان'' کی بھرپور عوامی پذیرائی کے بعد
معروف شاعر، مقبول ادیب اور منفرد کالم نگار

تازہ سفرنامہ

کے قلم سے قوس قزح کے رنگوں سے مزین

عامر بن علی

''نگر نگر اک نظر''

اشاعت کے مراحل میں داخل ہو گیا ہے

Amir Bin Ali has Reinvigorated the Urdu Poetry. He has always been a globelrotter filled with the passion for travelling. Wandering all around the globe in Search of New Sights & Experiences. He has written four poetry Books & Two Travelogues along with his Books of Interviews with Celebrities. He has translated several Nobel Prize laureates poets, as he is Expoert in Seven International Languages

آپ کے سامنے مضامین کا ایک مجموعہ ہے جو سفرنامہ نہیں، تحقیقی مقالہ بھی نہیں بلکہ ایک تجربہ نامہ ہے۔ مصنف نے جاپانی معاشرے کو اس کے اندر رہتے ہوئے خوب دیکھا، اپنا تجربہ خوب آزمایا۔ پھر ایک طویل عرصہ تک اردو صحافت سے وابستہ رہنے سے تحریروں کو عمدہ لکھنے کا تجربہ بھی انہیں بہت خوب ہے۔ اس لیے یہ تجربہ نامہ دوسرے سفرناموں سے منفرد ہے۔

پروفیسر سویا مانے (شعبہ اردو، اوساکا یونیورسٹی)

اس کتاب کی پاکستانی معاشرے کو بہت ضرورت ہے۔ شاید اس کے مطالعے سے چند افراد کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہمیں بھی اپنے ملک اور قوم کو ترقی کے راستے پر گامزن کرنے کے لیے دنیا سے کچھ سیکھنا ہے۔ اس کتاب میں سفرنامہ اور قیام نامہ دونوں کی خوبیوں کو یکجا کیا گیا ہے اور رواں، سلیس، ہلکی پھلکی نثر میں بہت کام کی باتیں تحریر کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

FEEL FREE TO READ ONLINE
www.amirbinali.com

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com